غالب کا سانحۂ اسیری
واقعاتی تحقیق اور غالب کا تخلیقی ردِعمل

محمد ساجد خان

Abstract

The present study focuses on the most significant event in Ghalib's life — that of his imprisonment. Encompassing the research of Ghalib's critics the paper firstly looks at: a) Ghalib's own reaction to and perception of the event, b) evidence found in contemporary newspapers, literary historians, c) the stance taken by his friends and in-laws. The second section analyses how the event impacted upon his own personality leaving deep, far-reaching, simultaneously destructive and fruitful impressions. The effects of this emotional and conceptual turmoil are discernible in his poetry

(۱)

ہندوستان کا غدر یا انقلاب مئی اٹھارہ سو ستاون میں برپا ہوا۔ چوں کہ نابغہ ہمیشہ اپنے زمانے سے ذہنی اور فکری طور پر آگے ہوتا ہے، غالب کی زندگی کا غدر دس سال قبل۔۔ ۲۵ رمئی ۱۸۴۷ء میں اُس وقت واقع ہوا جب انھیں جوا کھیلنے اور گھر پر جوا خانہ قائم کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا۔ زندگی کے پچاسویں برس میں پیش آنے والا یہ حادثہ مرگِ ناگہاں سے بڑھ کر دل دوز، رنج آور اور نتائج کے اعتبار سے نہایت بنیادی اور دوررس مضمرات کا حامل تھا۔ یہ دوسرا واقعہ تھا، قبل ازیں اس ''نحوست طالعی'' کا ٹریلر چل چکا تھا:

> ''اگست ۱۸۴۱ء میں غالب کی گھر پر جوا خانہ کے قیام میں گرفتاری، عدالت نے سو روپے جرمانہ کیا، عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں چار مہینہ قید، جرمانہ ادا کر دیا گیا۔''[۱]

اس ابتدائی گرفتاری اور بعد از جرمانہ رہائی پر ''ذکرِ غالب'' کے مولف کا تبصرہ یوں ہے:

> ''اگر خدا انھیں توفیق دیتا تو یہی سزائے جرمانہ اُن کے لیے عبرت کا سامان بن جاتی اور وہ آئندہ کے لیے اس بُری علت سے توبہ کر لیتے، لیکن بچپن کی عادتیں بھلا کہیں یوں آسانی سے ترک ہوتی ہیں۔''[۲]

اسی نوع کی محققانہ غیر محتاط پسندی کے سبب بالعموم یہ سمجھا جاتا ہے کہ غالب کی زندگی میں شراب اور جوئے کا عمل دخل عنفوانِ شباب سے بھی کچھ پہلے ہو چکا تھا۔ اس قیاس کی تمام تر عمارت جس بنیاد پر استوار کی جاتی ہے۔ وہ ننھیال نشینی کے ایام میں اُن کی مفروضہ فراغت، رئیس زادگی، مال و دولت کی فراوانی، ناز و نعم اور روک ٹوک کے لیے کسی بزرگ کا اُن کے سر پر نہ ہونا، بتائی جاتی ہے۔

حیاتِ غالب کے تشکیلی دور کے بارے میں ان مزعومات کی بنیاد غالب کے جس بیان پر رکھی جاتی ہے وہ ۱۹/اکتوبر ۱۸۵۸ء کے محررہ منشی شیونرائن آرام کے نام غالب کے خط کے ان جملوں پر ہے۔۔۔ ''شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو سال بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی میری عمر اور ایسی ہی عمر اُن کی۔ باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔۔۔ اس کڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔۔۔ بھائی تم سنو تو سہی، تمھارا دادا بہت کچھ پیدا کر گیا ہے۔۔۔ آیا وہ سب کارخانے تمھارے ہاتھ آئے یا نہیں، اس کا حال از روئے تفصیل جلد مجھ کو لکھو۔'' [۳]

ان سطور سے اتنے اہم نتائج نکالتے ہوئے اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ غالب نے یہ خط مطبع مفید الخلائق کے مہتمم (آرام) کو اپنی کتاب ''دستنبو'' کی اشاعت کے دنوں میں اُس وقت لکھا جب غدر کے فوری بعد کے زمانے میں دلّی کے تمام طباعت گھر تباہ ہو چکے تھے، دستنبو غالب کی نہایت غرض مندانہ اور ایک حد تک خطرناک تصنیف تھی جس کے ناشر کے دادا کے ساتھ قربت کے تعلقات کا اظہار اُن کی ضرورت تھی، ورنہ اپنے نانا غلام حسین کمیدان کے کارپرداز اور زمین جائیداد کے منصرم (بنسی دھر) سے کیا اختلاط اور دوستی ہو سکتی ہے! ورنہ غالب اُس کے پوتے سے اُس کے ''کارخانوں'' کا احوال دریافت نہ کرتے۔ غالب کی سوانح پر لکھنے والوں میں سے بیشتر انھیں ان کے نانا کے تمول اور والد کے نہ ہونے کے سبب آغازِ شباب سے بھی کچھ پہلے عیش و عشرت اور لہو و لعب میں مشغول بتاتے ہیں جب کہ شیخ اکرام غالب کے ''عہد طفولیت'' کی بالکل مختلف تعبیر کرتے ہیں۔۔۔ ''مرزا کا آگرے میں قیام ایک پھولوں کی سیج پر تھا، لیکن ان پھولوں میں کانٹے بھی تھے جو چبھتے تھے اور جن کی خلش دیر تک قائم رہی۔'' [۴]

ڈومنی ستم پیشہ'' تھی یا ''ستم زدہ'' اس بارے میں تو فیصلہ ہونا ابھی باقی ہے۔ شراب اور جوئے کے حوالے سے یہ واضح ہے کہ معاشرتی سطح پر مذموم کی گئی ان دونوں برائیوں کے بارے میں غالب کے رویے اور موقف کا بہ غور جائزہ لیے جانے کی ضرورت ہے۔ غالب ہر روز کے پینے والے تھے اور زیادہ تر اُدھار پیتے تھے لیکن کبھی اس عیب

کی پردہ پوشی کی انھوں نے ضرورت محسوس نہیں کی اور نہ ہی ان کے شریف النفس سوانح نگاروں اور شاگردوں نے اس بارے میں کسی تاویل یا عذر پر اصرار کیا! جوا اُدھار نہیں کھیلا جا سکتا لیکن نقد کیے جانے والے اس جرم کو ''الزام'' کی حد تک بے ضرر کرنے کی کوشش غالب نے بھی بہت کی اور غالب سے پیار کرنے والوں نے بھی۔ (دلائل اور حوالہ جات آگے آتے ہیں) اس لیے یہ سمجھنا شاید درست نہیں کہ غالب عنفوانِ شباب سے ہی جوا کھیلا کرتے تھے۔ اگست ۱۸۴۱ء سے قبل اس کی صریح شہادت حیاتِ غالب میں تلاش نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا اس امکان پر غور کرنا چاہیے کہ غالب کی زندگی میں یہ ''مصروفیت'' فراغت کے اُن دنوں (۱۸۳۵ء) کی پیدا کردہ ہوگی جب غالب پر واجب الادا قرض کی مجموعی رقم کے چالیس ہزار سے تجاوز کر جانے کے بعد وہ نالشوں کے ڈر سے تقریباً قید خانہ نشینی کی زندگی گزار رہے تھے۔ اس قرض کی رقم میں بڑا حصہ سفر کلکتہ کے مصارف کا تھا، جو غالب نے اپنی تباہ حال معیشت اور معاش کو سنبھالا دینے کے لیے اختیار کیا تھا اور ''ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقان کا'' کے مصداق مقدمۂ پنشن ہارنے اور امکانات قرض مسدود ہو جانے کے سبب ان کے مالی حالات میں بہتری کی کوئی امکانی صورت ہی باقی نہ رہی۔ اُدھر فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کے والی نواب شمس الدین سے تعلقات دشمنی کی حدوں میں تھے جب کہ نصر اللہ بیگ کے پس ماندگان کو وظیفہ فیروز پور جھرکہ کے محاصل کی رقم معاف کرانے کے عوض، اسی سرکار سے ملتا تھا۔ ان حالات میں یہ سمجھا جانا چاہیے کہ نواب شمس الدین کے پھانسی پانے کے دن (۸/اکتوبر ۱۸۳۵ء) تک غالب کا ذریعہ آمدنی جب کچھ بھی نہیں تھا، انھوں نے گھر پر جوا خانہ قائم کرنے اور اس حوالے سے اپنے کچھ ''ضروری اخراجات'' کی کفالت کی کوشش کی ہوگی۔ شراب اُن کے لیے ایک ضروری مشروب کا درجہ اختیار کر چکی تھی، ان کے اور اُن کے اہلِ خانہ اور دوست احباب کے لیے یہ عادت ان کا روزمرہ کا معمول اور طرز بود و ماند کا ایک لازمی حصہ دکھائی دیتی ہے۔ مراد یہ کہ غالب شناس، غالب کو ہوش سنبھالتے اور شراب میں باہوش ہوتے ایک ساتھ دیکھتے ہیں۔ مدہوش اس لیے نہیں کہ یہ غالب کے کردار، ذات اور سوانح سے ثابت نہیں کہ وہ بہکنے کے لیے پیتے ہوں یا پی کر بہکتے ہوں۔ شعر کہنے کا معاملہ استثنائی ہے۔ لہٰذا اگر جوئے کا معاملہ بھی اسی طرح کی شہرت کا حامل ہوتا تو غالب اور محبانِ غالب کے لیے اس عادت کی جھوٹی سچی تاویلات کا امکان باقی نہ رہتا۔ غالب کا بیان اس بارے میں کچھ اس طرح ہے۔ [فارسی خط بنام تفضّل حسین خان ترجمہ الطاف حسین حالی بحوالہ یادگارِ غالب]

''کوتوال دشمن تھا اور مجسٹریٹ ناواقف، فتنہ گھات میں تھا اور ستارہ گردش میں'' [۵]

مولانا ابوالکلام آزاد نے حالی کے اس بیان پر ''مرزا کو شطرنج اور چوسر کھیلنے کی بہت عادت تھی اور چوسر جب

بھی کھیلتے تھے، برائے نام کچھ بازی بدکر کھیلا کرتے تھے۔اسی چوسر کی بدولت ۱۲۶۴ھ میں مرزا پر ایک سخت ناگوار واقعہ گزرا۔''[۶] اپنے غیض وغضب کا یوں اظہار کیا ہے۔۔۔''خواجہ حالی مرحوم نے اس واقعہ کی نسبت جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقت کے قطعاً خلاف ہے۔خواجہ مرحوم سوانح نگاری کو محض مدحت طرازی سمجھتے تھے،اس لیے پسند نہیں کرتے تھے کہ ناگوار واقعات کو اُبھرنے دیا جائے۔[۷]

حالی کے بیان میں تو بہت حد تک اعترافِ جرم موجودہ ہے جب کہ اس واقعہ کے بارے میں دو معاصر شہادتیں ایسی ہیں جن میں غالب کی گرفتاری کو انھی کے الفاظ میں کوتوال دشمنی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔نصیر کے شاگرد منشی گھن شیام داس عاصی دہلوی نے قطعہ تاریخ اسیری ''اور اٹھارہ سو سینتالیس قید غریباں ہے'' کے بعد جو عبارت لکھی اس کی ابتدا یوں ہے:

> ''مرزا نوشہ شاعر بے بدل، رند مشرب المتخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہوگئی اور اس نے بعلت قمار بازی ان کو قید کرا دیا۔۔۔''[۸]

''احسن الاخبار'' بمبئی ۲۵ر جون ۱۸۴۷ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

> ''مرزا اسداللہ خاں بہادر کو دشمنوں کی غلط اطلاعات کے باعث قمار بازی کے جرم میں قید کیا گیا۔معظم الدولہ بہادر (ریذیڈنٹ دلّی) کے نام سفارشی چٹھی (بہادر شاہ ظفر کی طرف سے) لکھی گئی کہ ان کو رہا کر دیا جائے یہ معززین شہر میں سے ہیں اور جو کچھ ہوا ہے محض حاسدوں کی فتنہ پردازی کا نتیجہ ہے۔نواب صاحب کلاں بہادر (ریذیڈنٹ) نے جواب دیا کہ مقدمہ عدالت کے سپرد ہے ایسی حالت میں قانون سفارش کی اجازت نہیں دیتا۔''[۹]

اس سلسلے میں آخری دلیل،نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا وہ بیان ہے جو اس واقعۂ قید و بند ذلت میں غالب نوازی کے جواز کے طور پر انھوں نے ہمیشہ دیا، بقول غلام رسول مہر:

> ''وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے''مجھے مرزا سے عقیدت ان کے زہد و اتقا کی بنا پر نہ تھی، فضل و کمال کی بنا پر تھی، جوئے کا الزام آج عاید ہوا مگر شراب پینا تو ہمیشہ سے معلوم ہے پھر اس الزام و گرفتاری کی وجہ سے میری عقیدت کیوں متزلزل ہو جائے۔''[۱۰]

ان شواہد سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ غالب اگرچہ اگست ۱۸۴۱ء (اوّلین گرفتاری و جرمانہ بقدر سو

روپیہ) سے شاید پہلے بھی جوا کھیلتے ہوں گے، لیکن ان کا نام اس حوالے سے اس حد تک بدنام نہیں تھا جیسا بعض غالب شناسوں نے سمجھ لیا ہے اور یہ بات مستعبد نہیں کہ اگر ستاروں کی گردش اور نصیب کی کوتاہی شامل حال ہو کر بات کو اسیری تک نہ پہنچا دیتی تو ''جوئے کی عادت'' ان کی سوانح و شخصیت کا کوئی قابل ذکر پہلو قرار نہ پاتی۔

گزشتہ سطور کے اقتباسات کا بہ غور مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ غالب اور حامیانِ غالب کے بیانات میں اُن کے جوئے میں ملوث ہونے سے انکار میں اتنا زور، اصرار اور شد و مد نہیں جتنا اس بارے میں کہ یہ معاملہ کوتاہ نصیبی اور دشمنوں کی عداوات کا وار کارگر ہو جانے کا شاخسانہ ہے۔

غالب کے زمانے میں بھی آج کی طرح قانون کی رو سے جرم قرار پانے کے باوجود سماجی نوعیت کی اس خرابی کے بارے میں قانون کا تحرک ''خاص وجوہ'' کی بنا پر ہی ہوا کرتا تھا۔ گرفتاری غالب کے باب میں یہ ''خاص وجوہ'' کارفرما رہی ہوں گی، ایک خاص وجہ جوئے کی وبا کے ان ایام میں، فیض الحسن نامی ایک ''نرے کوتوال'' کی اس علاقے کے تھانے میں تعیناتی تھی۔ ۱۸۴۱ء کے واقعہ میں تو شاید یہ کوتوال نہیں تھا کیوں کہ بقول آزاد اس کا تقرر غالباً ۱۸۴۵ء میں ہوا۔ ''احسن الاخبار'' بمبئی نے ۲۰ر جون ۱۸۴۵ء کو لکھا۔۔۔ ''کوتوال شہر نے سولہ آدمیوں کو قمار بازی کے جرم میں گرفتار کر کے حاکم کے سامنے پیش کیا۔ نو آدمیوں کو چھ مہینے کی قید اور پچاس روپے جرمانہ اور پانچ آدمیوں کو تین مہینے کی قید اور پچیس روپے جرمانہ اور دو آدمیوں کو ایک مہینے کی قید اور چار روپے جرمانہ کی سزا کا حکم سنایا گیا اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں حکم ہوا کہ ایسے لوگوں کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کی سڑکوں کی تعمیر و درستی کا کام لیا جائے۔''[۱۱]

یہ مجرم طبقہ عوام سے دکھائی دیتے ہیں، یقیناً یہ واقعہ غالب کے علم میں آیا ہوگا لہٰذا قابلِ توجہ امر یہ کہ ۱۸۴۱ء میں جرمانے کی سزا ہونے اور متعلقہ تھانے میں ''دشمن کوتوال'' کے تقرر کے باوجود غالب نے یہ شغل ترک کیا اور نہ اس کے انعقاد میں احتیاط برتی۔ اس کی بڑی وجہ اُن کے شاعرانہ لاابالی پن سے زیادہ اس صداقت میں تلاش کرنا چاہیے کہ ''اور شہر کے کئی دیوان خانوں کی مجلسیں اس باب میں شہرت رکھتی تھیں۔۔۔ انگریزی قانون اسے جرم قرار دیتا تھا لیکن شہر کی یہ رسم ٹھہر گئی تھی کہ رئیس زادوں کے دیوان خانے مستثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ گویا اُن کی وہ نوعیت مان لی گئی تھی جو آج کل کے کلبوں میں برج کھیلنے کی ہے، انھیں از راہ تجاہل رئیسانہ تفریحوں کے ذیل میں تصور کیا جاتا تھا۔''[۱۲]

۱۸۴۷ء میں اسیری کی اَن ہونی کے ہو جانے تک غالب نہ صرف خود کو ہر اعتبار سے رئیس زادہ تصور کرتے

تھے بلکہ ان کو قانون کی زد میں لانے والوں کو بھی خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔ دہلی اُردو اخبار کا رویہ غالب کے ساتھ قدرے مخاصمانہ ہے، لیکن غالب کے مقام کی نشان دہی بہت خوبی سے ہوتی ہے مثلاً ۱۵/اگست ۱۸۴۱ء کے شمارے میں ''قمار بازان'' کے عنوان سے لکھتا ہے۔

> ''سنا گیا ہے کہ ان دنوں تھانہ گزر قاسم جان میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز مثل ہاشم خان وغیرہ ۔۔۔ گرفتار ہوئے، کہتے ہیں بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بہ سبب رعب و کثرت مرداں کے کسی طرح سے کوئی تھانیدار دست انداز نہیں ہوسکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانیدار قوم سے سیّد اور بہت جری سنا جاتا ہے۔۔۔ بہت بے طمع ہے۔۔۔ مرزا نوشہ نامی ایک شاعر اور رئیس زادہ، نواب شمس الدین احمد خان قاتل ولیم فریزر کے قرابت قریبیہ میں سے ہے۔ یقین ہے تھانے دار کے پاس بہت سے رئیسوں کی سعی وسفارش بھی آئی لیکن اُس نے دیانت کو کام فرمایا سب کو گرفتار کیا۔۔۔ لیکن اس علاقے میں بہت رشتہ دار متمول اس رئیس کے ہیں کچھ تعجب نہیں کہ بے وقت چوٹ پھٹ کریں اور یہ دیانت ان کی وبالِ جان ہو حکام ایسے تھانے دار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کم یاب ہوتا ہے۔''[۱۳]

اس کم یاب آدمی کی بجا آوری فرائض کو ''نایاب آدمی'' سے وابستہ دہلی کی اشرافیہ نے بروقت متحرک ہوکر سو روپے جرمانے کی حد تک بے اثر کر دیا۔ غالب شاید درست ہی سمجھتے تھے کہ قانون ان کے سلسلے میں اس حد تک ہی نامہربان ہوسکتا ہے کیوں کہ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ اگست ۱۸۴۱ء سے مئی ۱۸۴۷ء تک غالب نے یہ شغل موقوف کیے رکھا ہوگا۔ پہلی اور دوسری سزا کے درمیان چھ سال کا وقفہ، غالب کی سماجی حیثیت کے استحکام کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ وہ تو آسمان نے ایک مردِ گراں مایہ کو پسِ دیوارِ زنداں دیکھنے کی ٹھان لی تھی ورنہ یہ تھی ہر اعتبار سے انہونی۔ بادشاہِ وقت خواہ کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو اس معمولی مقدمے میں اس کی سفارش کو ریذیڈنٹ پذیرائی نہ بخشے، اخبارات، صحافیانہ غیر جانبداری ترک کر کے براہ راست حمایت کریں اور غالب کی سزا کو انھیں ہلاک کرنے کی صورت قرار دیں۔

> ''مرزا اسداللہ غالب پر عدالت فوجداری میں جو مقدمہ دائر تھا اس کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دوسو روپے جرمانے کی سزا ہوئی۔ اگر دوسو روپے

جرمانہ ادا نہ کریں تو چھ ماہ قید میں اور اضافہ ہو جائے گا۔ مقررہ جرمانے کے علاوہ اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جائیں تو مشقت معاف ہو جائے گی جب اس بات پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصے سے علیل رہتے ہیں، سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مشقت اور مصیبت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے امید کی جاتی ہے کہ اگر سیشن جج کی عدالت میں اپیل کی جائے اور اس مقدمے پر نظر ثانی ہو تو نہ صرف یہ سزا موقوف ہو جائے بلکہ عدالت فوجداری سے مقدمہ اٹھا لیا جائے۔ یہ بات عدل و انصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت و حشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے معمولی جرم میں اتنی سزا دی جائے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔'' [۱۴]

فلک کج رفتار نے اس رئیس زادے کی مالی حالت کو سقیم کر دیا تھا تو کیا، معاشرتی سطح پر ان کا نہایت معزز ہونے کا تاثر قائم تھا یہاں تک کہ اگر ریذیڈنٹ ولیم فریزر جیسا فارسی شعر و ادب کا رسیا، مقامی حسن اور رقص و سرود کی محافل میں دلچسپی لینے والا ہو تو غالب کو اتنے بڑے حاکم سے ہم پیالگی کا اعزاز بھی حاصل ہوتا تھا۔ اس وقت کے سیشن جج کے بارے میں انھوں نے ایک فارسی خط میں لکھا:

''سیشن جج، باوجودیکہ میرا دوست تھا اور ہمیشہ مجھ سے دوستی اور مہربانی کا برتاؤ برتتا تھا اور اکثر صحبتوں میں بے تکلفانہ ملتا تھا اس نے بھی اغماض اور تغافل اختیار کیا۔'' [۱۵]

حیاتِ غالب کے اس سیاہ ترین دن کی منصوبہ بندی کج رفتار آسمان اور فیض الحسن خان کوتوال نے باہمی مشاورت سے کی تھی۔ اگر عاصی دہلوی کے دیوان میں درج واقعہ درست ہے تو تذلیل غالب کا یہ منظر نہ دیدنی ہے نہ شنیدنی۔

''۔۔۔ بروقتِ گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقع پر گئے اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں، اس دھوکے سے اندر داخل ہو گئے اور اندر مکان کے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں کے باہر تک آواز آتی تھی مگر زینے کے اندر بہت جمیت تھی اور کچھ امدادی برق انداز پہنچ گئے۔ گرفتار کر کے قید کرا دیا۔ بہت سے رئیس و شرفا اس حرکت سے ناراض تھے اور عدالت میں برأت کے مساعی ہوئے، مگر قید ہو گئی۔'' [۱۶]

ہم عصر تذکرہ نگار مولوی کریم الدین نے اسی سال اپنے تذکرے ''تذکرہ شعرائے اردو'' میں اس سانحہ کے حوالے سے یہ لکھا۔۔۔''ان ایام میں یعنی درمیان ۱۸۴۷ء کے ایک حادثہ ان پر جانب سرکار سے پڑا۔جس کے سبب اُن کو بہت رنج لاحق ہوا عمر اُن کی اس سال قریب ساٹھ سال کے ہوگی۔''[۱۷]

خواجہ حالی کی کم وبیش ہر بات کو''پردہ پوشی'' کی نظر سے دیکھنا اور اُن کے ہر بیان کو رفع دفع اور صلح صفائی کو کوشش سمجھنا، بہت سے اردو تحقیق نگاروں کا دستور بن گیا ہے۔مثال کے طور پر حالی کا یہ''بے ضرر بیان'' اگرچہ منجملہ چھ مہینے کے تین مہینے جوان کو قید خانے میں گزرے، اُن کو کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوئی، وہ بالکل قید خانے میں اُسی آرام سے رہے۔جیسے گھر پر رہتے تھے، کھانا اور کپڑا اور تمام ضروریات حسب دل خواہ گھر سے اُن کو پہنچتی تھیں۔ان کے دوست اُن سے ملنے جاتے تھے اور وہ صرف بطور نظر بندوں کے جیل خانے کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے۔''[۱۸] کچھ لوگ بااہتمام اس کی تغلیط فرماتے ہیں اور دلیل میں حبسیہ غالب کا یہ شعر درج کرتے ہیں:

شادم از قید کہ از بند معاش آزادم　　از کف شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

''میری رائے میں یہ محض سخن گستری ہے یا ممکن ہے ابتدائی ایام کی کیفیت یہی ہو اور پچاس روپے ادا کر دینے پر مناسب سہولتیں بہم پہنچی ہوں۔''[۱۹]

اگرچہ غالب نے ۱۸۲۸ء میں ہی کلکتہ میں کہی گئی ایک تہلکہ خیز غزل میں کہا تھا:

گر دہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب　　رسم اُمید ہمانا ز جہاں بر خیزد

اس شعر کا خمیر جن تجربات سے اٹھا ہے، وہ یقیناً معاش کے سلسلے میں خاندانِ لوہارو کا روّیہ ہے۔بزرگ مہربان نواب احمد بخش خان کے بزرگانہ اقدامات کے سبب ہی وہ کلکتہ کا سفر اختیار کرنے پر مجبور ہوتے تھے، لیکن اس شعر کی معنوی تکمیل اسیری کے تجربے کے دوران ہوئی۔ابوالکلام آزاد خواجہ حالی سے معلوم کردہ روایت کی بنیاد پر رقم طراز ہیں:

> ''جونہی مرزا گرفتار ہوئے اور رہائی کی طرف سے مایوسی ہوگئی نہ صرف دوستوں اور جلیسوں نے بلکہ عزیزوں نے بھی یک قلم آنکھیں پھیر لیں اور اس بات میں شرمندگی محسوس کرنے لگے کہ میرزا کے عزیز وقریب تصور کیے جائیں اس باب میں خاندان لوہارو کا جو طرز عمل رہا وہ نہایت افسوس ناک تھا۔''[۲۰]

آزاد کے بقول حالی کے اس بیان کی تصدیق نواب سر امیر الدین نے بھی کی۔غالب اس خاندان کے داماد ہی نہیں تھے، پنشن کی حقیقی رقم کی ادائیگی کے حوالے سے غالب کے باب میں یہ خانوادہ نادہندہ بھی تھا۔بالخصوص

امین الدین کے چھوٹے بھائی نواب ضیاءالدین جو دہلی ہی میں رہتے تھے جن پر غالب نے ایک قصیدے میں ناز کیا اور جو صرف شعروادب کے حوالے سے غالب سے تلمذ نہیں تھے، ابتدائی نوشت وخواند کے ایام میں بھی غالب سے فیض یاب ہوئے تھے، نے بھی آنکھیں پھیر لیں اور ایک اسیر جرم سے ملنا اپنی شان سے فروتر گردانا، یہاں تک کہ جب آگرہ کے ایک اخبار نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مرزا کو خاندانِ لوہارو کا رشتہ دار ظاہر کیا تو ان لوگوں پر یہ امر بے حد شاق گزرا اور اہتمام وتکلف سے اس کی تغلیط شائع کرائی گئی اور لکھوایا۔۔۔''مرزا صاحب سے خاندانِ لوہارو کا کوئی نسبی تعلق نہیں محض دور کا سببی تعلق ہے۔''اسیری کی ابتدا کے ایام میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ کا درخشندہ چہرہ زندانِ غالب کے کلبۂ تاریک میں روشنی اور امید کی واحد کرن دکھائی دیتا ہے۔جس کا والہانہ اظہار غالب نے ''حبسیہ'' کے اشعار میں کیا:

> ''اپنے غم میں خون کے گھونٹ بھرنے کی ضرورت اب نہیں، کہ رحمت خداوندی نے (میری غم خواری کے لیے) بشر کا روپ دھار لیا ہے۔ایک امیر شہر کی خبر گیری سے میرا مقامِ ذات بلند دکھائی دینے لگا ہے۔وہ مصطفیٰ خان ہے کہ اس واقعۂ غم میں میرا غم خوار ہے، اگر میں مر بھی جاؤں تو کیا غمِ مرگ میرا تو رونے والا ہے۔''[۲۱]

مقالے کے اس حصے کے آخر میں سانحہ اسیری کے حوالے سے ابوالکلام آزاد کی فراہم کردہ اُن معلومات کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے، جن کے راوی نواب سر امیر الدین والی لوہارو ہیں۔آزاد کی فراہم کردہ معلومات بے حد اہم ہیں کہ غلام رسول مہر سے لے کر اب تک اس موضوع پر لکھنے والوں نے انھیں مستند بھی جانا ہے اور یہ معلومات اسیری کے واقعے کی جزئیات کی تکمیل بھی کرتی ہیں۔

حالی کو لعن طعن کرنے کے بعد آزاد بیان کرتے ہیں:

> ''خواجہ صاحب نے اس معاملے کو اس رنگ میں ظاہر کیا ہے کہ گویا کوئی بات نہ تھی محض چوسر اور شطرنج کا شوق تھا اس شوق کی تکمیل کے لیے برائے نام کچھ بازی بھی بدلیا کرتے تھے، کوتوال چوں کہ دشمن تھا، اس لیے قمار بازی کا مقدمہ بنا دیا حالانکہ اصلیت بالکل اس کے خلاف ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ پورا قمار بازی کا معاملہ تھا اور نواب امیر الدین مرحوم کے لفظوں میں ''مرزا نے اپنے مکان کو جوا بازی کا اڈا بنا رکھا تھا۔''[۲۲]

کوئی بھی حالی کو یہ رعایت دینے پر تیار نہیں کہ ممکن ہے وہ اس معاملے سے اس حد تک ہی باخبر ہوں، جس حد

تک انھوں نے اسے بیان کیا۔ بہرحال لوہارو والوں کے لیے یہ خاندان کے نام اور ناموس ،عزت اور شہرت کا معاملہ تھا اور مرزا کے معاملے میں وہ اپنے طور پر عاجز آ چکے تھے۔ خاندان لوہارو کے اس طرزِ عمل کی تفہیم کے لیے کچھ مزید انکشافات آگے آئیں گے۔

> ''غدر سے پہلے مرزا کی آمدنی کا وسیلہ صرف سرکاری وظیفہ اور قلعہ کے پچاس روپے تھے چوں کہ رئیسانہ زندگی بسر کرنا چاہتے تھے اس لیے ہمیشہ مقروض و پریشان حال رہتے تھے۔''[۲۳]

حیرت ہے ''علائی مولائی یار بھتیجے گویا بھائی'' کے صاحبزادے جسے بتایا گیا کہ غالب کے خطوط شائع ہو رہے ہیں، اپنے نام کا بھی کوئی خط مرزا صاحب سے لکھوالو، اور وہ خط وہی ہے جس میں غالب نے انھیں بتایا کہ تمھارے دادا تو امین الدین احمد خان ہیں، میں تو تمھارا دل دادہ ہوں، اس قدر قریبی عزیز کو بھی یہ معلوم نہیں کہ قلعہ کے پچاس روپے کا آغاز جولائی ۱۸۵۰ء سے ہوتا ہے جب کہ اسیری کا واقعہ تین سال قبل کا ہے۔ اُن کے بیان کے مزید اہم نکات درج ذیل ہیں۔ اُس زمانے میں دہلی کے بےفکر رئیس زادوں اور چاندنی چوک کے جوہری بچوں نے گزرانِ وقت کے لیے قمار کا مشغلہ بصورتِ گنجفہ اپنا رکھا تھا۔ شہر کے کئی دیوان خانے اس باب میں شہرت رکھتے تھے، مرزا نے بےمحنت و مشقت رقم کمانے کے لیے اپنے دیوان خانے میں قمار بازوں کو مدعو کرنا شروع کیا کہ مہتمم قمار خانہ کا ایک خاص حصہ ہر بازی میں ہوتا ہے، خود کھیل کر (کہ اچھے کھلاڑی تھے) جو کماتے ہوں گے، وہ الگ۔ (اس بیان سے ہمارے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ غالب نے قمار بازی کا شغل معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ان دنوں میں اختیار کیا ہوگا جب ان کے ذرائع آمدن (بوجہ مقدار قرض و نادہندگی) مسدود ہو گئے تھے۔ مزید یہ کہ غالبیات کا سرمایہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ ۱۹۳۵ء میں ان پر ۴۰ ہزار سے متجاوز قرض کی رقم بالآخر کہاں سے ادا کی گئی، اس لیے گمان ہوتا ہے کہ شاید اسی ذریعہ آمدن سے غالب نے اپنا بیشتر قرض ادا کیا ہو) وہ مزید بیان کرتے ہیں کہ ''نرے کوتوال'' کی آمد کے بعد حالات مرزا خانی کوتوال کے دور جیسے نہ رہے اور دوستوں کے بار بار فہمائش کرنے پر کہ مرزا ان مجلسوں کو ملتوی کر دیں، وہ خبردار نہ ہوئے اور اس زعم میں رہے کہ میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ ایک دن ایسے موقع پر کہ مجلس قمار گرم اور روپوں کی ڈھیریاں چنی ہوئی تھیں، کوتوال پہنچا، باقی لوگ بھاگ گئے اور مرزا دھر لیے گئے۔ نواب صاحب کے بیان میں ایک اور تضاد یہ اُبھرتا ہے کہ وہ ایک طرف تو اس نئے کوتوال کو جرائم کے سدباب میں فرض شناس افسر دکھاتے ہیں، اور بعد میں یہ بیان کرتے ہیں ''اُن کی گرفتاری سے پہلے چند جوہری

پکڑے گئے تھے مگر روپیہ خرچ کر کے بچ گئے تھے مقدمہ تک نوبت نہیں پہنچی، مرزا کے پاس روپیہ کہاں تھا۔۔۔'' [۲۴]

نواب صاحب کے مطابق غالب کے اعزا و احباب نے بادشاہ سے سفارش کرائی، لیکن بے سود، تھک ہار کر گھر بیٹھ رہے، کوتوال سخت مزاج تھا اور حکام سے عدم مداخلت کا اقرار لے چکا تھا، سفارشوں سے بات بننے والی نہ تھی۔ [۲۵] اور یوں دلّی کا اشرافیہ اپنے ایک معزز مگر کم وسیلہ رکن کو قید کا حکم سنائے جانے سے نہ بچا سکا اور کوتوال سے سیشن تک اس کی تمام مساعی رائیگاں رہیں اور کوئی ''کنکشن''، ''کلک'' نہ کر سکا۔ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بدلتے ہوئے سیاسی اور معاشی ڈھانچے میں، طبقہ اشرافیہ کے کم موثر بلکہ سبک ہونے کا علامتی اظہار قرار پائے گا یا احباب غالب کے اخلاص کی شدت میں کمی رہ گئی تھی۔ بہر حال یہ ثابت ہے کہ غالب کی سزا شاید قانون کی بالادستی ہو، لیکن ان کی سزا کی نصف مدت بعد ہی رہائی جس ''اسم اعظم'' کی تاثیر سے ہوئی، وہ وہی ہے جو مطلب برآری کے لیے آج بھی مہامنتر ہے یعنی تعلقات، اثر و رسوخ کے ذریعے قانون کی رعایت اور لچک کو روبہ عمل لا کر مدعا حاصل کرنا۔ تاہم یہاں بھی غالب کی ''عاقلانہ مصلحت پسندی'' نے صورت واقعہ کو مبہم کرنے کی کوشش کی۔

> ''۔۔۔ پھر معلوم نہیں کیا باعث ہوا کہ جب آدھی معیاد گزر گئی تو مجسٹریٹ کو رحم آیا اور صدر میں میری رہائی کی رپورٹ کی اور وہاں سے حکم رہائی کا آ گیا اور حکام صدر نے ایسی رپورٹ بھیجنے پر اس کی بہت تعریف کی۔ سنا ہے کہ رحم دل حاکموں نے مجسٹریٹ کو بہت نفرین کی اور میری خاکساری اور آزادہ روی سے اس کو مطلع کیا، یہاں تک کہ اُس نے خود بخود میری رہائی کی رپورٹ بھیج دی۔'' [۲۶]

سیّد ناصر نذیر فراق نے قلعہ کی ملازمہ کے توسط سے بتایا ہے کہ غالب کا مقدمہ کنور وزیر علی خاں کی عدالت میں پیش ہوا اور قبل از وقت رہائی لاٹ صاحب (مسٹر جیمس طامسن؟؟) یا کسی اور بڑے افسر کے اختیاراتِ خاص کی وجہ سے ہوئی۔ (۲۷) عاصی دہلوی نے رہائی کا جو سبب بیان کیا وہ شیخ اکرام صاحب کے خیال میں ناصر نذیر کی بیان کردہ صورت سے تطابق نہیں رکھتا۔۔۔ ''ایک روز مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی، قیدیانِ جیل خانہ کو ملاحظہ کرتے حضرت کے پاس پہنچ گئے اور حال دریافت کیا، آپ نے فی البدیہہ فرمایا

جس دن سے کہ ہم غم زدہ زنجیر بہ پا ہیں کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا۔'' [۲۸]

[غلام رسول مہر صاحب نے مذکورہ شعر کو غالب کا ماننے سے انکار کیا ہے، جب کہ ایسا نہیں، شعر غالب کا ہی ہے اور ہے بھی ۱۸۴۷ء کا، البتہ ممکن ہے اس کا محل تخلیق کچھ (یا بہت) مختلف ہو]

اگر دیکھا جائے تو رہائی سے متعلق بیانات قدرے مختلف ہوتے ہوتے بھی ایک ہی جیسی صورت واقعہ کو جنم دے رہے ہیں۔ معززین شہر (اور بہت حد تک نواب شیفتہ) کی مساعی عدالتی نظام پر سامنے کی طرف سے اثر انداز نہ ہو سکیں تو انھوں نے غالب کی صحت کے حوالے سے طبّی بنیادوں پر رہائی کا راستہ باوساطت سول سرجن نکالا اور ظاہر ہے ڈاکٹر کی سفارش، جیل اور عدالتی حکام کے توثیقی ریمارکس کے ساتھ حکام صدر تک پہنچی ہوں گی!

رہائی کی قطعی تاریخ کسی نے تحقیق نہیں کی۔ البتہ اگر تین ماہ کی مدت کو گرفتاری کے دن، ۲۵ مئی سے شمار کیا جائے تو یہ رہائی ۳۰، ۲۵ اگست کے درمیان ہوئی ہوگی۔ اس لیے غلام رسول مہر کا یہ خیال درست نہیں۔۔۔ ''اگر یہ درست ہے کہ وہ اواخر جون میں گرفتار ہوئے تو جولائی اگست اور ستمبر کے مہینے یقینی طور پر جیل میں گزرے۔'' [۲۹]

غالب جس کے دل دادا تھے نواب امیر الدین، کا بیان ابوالکلام آزاد کی زبانی اس سارے قصے کا اہم ترین حوالہ ہے، تاہم اس قریبی شہادت کے اعتبار کا تعین کرتے وقت چند مزید امور کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ نواب امیر الدین کا بیان اور موقف خاندان لوہارو کے مطابق ہے جو غالب کا سسرالی خاندان ہے، جس کے غالب کی زندگی پر احسانات بھی بہت ہیں اور مظالم بھی۔ اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کا فر پہ دم نکلے! دو دفعہ نواب امین الدین نے عدالت میں قرض اور جرمانہ ادا کر کے غالب کی گلوخلاصی کرائی تھی۔ لیکن شاید اب کی بار اُن کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا، غالب کی ہر طرح کی معاونت سے دست کش ہونے کے روّیے کو حالی سے اب تک بہت تنقید کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے۔ اس معاملے پر گزشتہ سالوں میں اسی خاندان کے ایک فرد جناب جمیل الدین عالی کے انکشافات سے کچھ مزید روشنی پڑتی ہے۔ ان کے بقول وہ سترہ برس کی عمر میں لوہارو گئے تھے اور وہاں انھوں نے سو سے اوپر غالب کے اُردو اور فارسی خطوط تھیلوں میں بند دیکھے، اس وقت کے والیٔ ریاست نواب امین الدین ثانی کی توجہ ان خطوط کی طرف دلانے پر اُن کا جواب، لوہارو خاندان کے روایتی موقف کے مطابق ہے:

> ''جی ہاں مجھے علم ہے کہ ان خطوط میں کیا ہے، ان کی اشاعت ہمارے خاندانی وقار کے خلاف ہے۔ پچھلے زمانے میں جو خطوط آپ کے (میرے) والد اور دادا نے دے دیئے، دیکھ بھال کر دینے چاہیں تھے۔ مرزا مرحوم سے ہمارے قبیلے کی ایک خاتون کیا بیاہی، ان کی تمام فضولیات میں ہمارا خاندان ضرور ملوث ہوتا ہے۔'' [۳۰]

اس لیے ضروری ہے کہ امیر الدین کے بیانات کو اسی ''رشتہ دارانہ تناظر'' میں دیکھنا چاہیے۔ عالی صاحب کی یادداشت پر انحصار نہ کرنے اور ان کے بیان کو درست نہ سمجھنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں، اس لیے اس ذیل میں اُن کے مقدمہ ''حرفے چند'' جو انھوں نے انجمن ترقی اُردو کے معتمد اور ناشر کے طور پر خلیق انجم کی کتاب ''غالب کے خطوط'' کی جلد اوّل سے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو۔ یہاں سے گویا اسیری کے اثرات کی بحث بھی شروع ہو جائے گی کہ قید کے اس واقعے نے لوہارو خاندان سے غالب کے نازک اور متنازعہ، بہت گہرے اور نہایت کمزور رشتے کے گراف کو کن اُفقی اور عمودی بلندیوں یا پستیوں سے گزارا۔

> ''اُردو کے بیشتر خط غالب کی اہلیہ امراؤ بیگم کے چچازار بھائی اور والیٔ لوہارو، میرے پردادا نواب امین الدین خان کے نام تھے اور ان میں سبھی کافی مختصر تھے، ان میں اکثر خطوط جوئے والے معاملے سے متعلق تھے، مقدمہ لڑنے کے لیے مالی امداد طلب کی گئی تھی۔ جیل کے خطوط بھی تھے، جیل کے بعد سخت برہمی کا اظہار بھی تھا، ایک دو میں صاف صاف یہ تھا کہ تم نے میری خبر خود آ کر نہ لی، لوگوں کو بھیجا''

معلوم ہوتا ہے یہاں سے یہ لکھا جاتا تھا کہ تم نے خاندان کو بدنام کیا وغیرہ وغیرہ کیوں کہ ایک میں واضح طور پر یہ تھا کہ اگر تم بھی اس مقدمے کی کارروائی کو سچ سمجھتے ہو، اور میری سزا کو حق جانتے ہو اور خاندان کے لیے میری رشتہ داری کو بدنامی کا باعث تو اپنی بہن کو بلالو۔ معلوم ہوتا ہے یہاں سے لکھا گیا کہ اچھا انھیں بھیج دو۔ ایک فرستادہ کا بھی ذکر تھا۔ غالب کا خط کہتا تھا کہ تمھارے آدمی خط لے کر آئے، تمھاری بہن جانے سے انکاری ہیں۔''[۳۱]

مذکورہ اقتباس نہ صرف غالب کی ازدواجی زندگی کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے بلکہ غالب کی اردو خط نویسی کی تحقیق پر بھی اثر انداز ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ خاندان لوہارو سے غالب کے تعلقات کی شاید یہ سب سے نچلی سطح تھی۔ اس سے زیادہ یہ تعلقات کبھی خراب نہ ہوئے ہوں گے۔ البتہ بعد از ستاون ان کے خطوط بنام امین الدین و علاؤالدین میں فریقین کے مابین گہری قربت اور شدتِ اخلاص دیکھی جا سکتی ہے۔

(۲)

یہ جائزہ لینے سے پہلے کہ شاعری میں غالب کے تخلیقی ردِعمل اور رجحانات کو دکھ، ملال، رنج و غم اور تباہ کن اثرات کے حامل اس دل دوز واقعے نے کس انداز میں متاثر کیا، ضروری دکھائی دیتا ہے کہ غالب پر اس اسیری کے اثرات پر نگاہ ڈالی جائے۔ اس حوالے سے غالب کا نثری ردِعمل بہت اہمیت کا حامل ہے۔ یادگارِ غالب میں حالی نے

اس فارسی خط کا نہایت موثر اُردو ترجمہ دیا ہے اور اصل خط امتاز علی خان عرشی کے مرتبہ ''دیوانِ غالب'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ المیہ حزن و ملال، افسردگی اور ترکِ دنیا کے خیالات اس خط میں جس کیفیت کے حامل ہیں ان کا شاعرانہ سخن گستری سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ واقعہ بیان کرنے کے بعد غالب خط کے دوسرے حصے میں لکھتے ہیں:

''اگرچہ میں اس وجہ سے کہ ہر کام کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا، جو کچھ گزرا اُس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گزرنے والا ہے اُس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے، میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں، روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے، یہ بھی جانے دو، خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمت اللعالمین دل دادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ واماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جاں فرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں، سر بصحرا نکل جاؤں، یہ ہے جو کچھ کہ مجھ پہ گزرا، اور یہ ہے جس کا میں آرزومند ہوں۔''[۳۲]

اس احساس کی کارفرمائی غالب کی بعد از ۱۸۴۷ء کی غزلوں میں صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ اس واقعے نے غالب کے تصور جاگیرداری پر کاری ضرب لگائی اور ۱۸۴۷ء سے قبل ان کی زندگی میں خود کو شاعر سے پہلے ''جاگیردار سونک وسونسا'' سمجھنے اور رئیس زادگی سے کم تر کسی بات پر سمجھوتہ نہ کرنے کا جو رجحان ملتا ہے، اس کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ خود انھوں نے اس واقعے کے اثراتِ بد اور خلش کو پانچ سال بعد بھی محسوس کیا۔ غالب کو جب معلوم ہوا کہ جے پور کا جواں سال و جواں دولت راجہ ان کی غزلیں اخبارات میں دیکھ کر اُن کا معتقد ہوا ہے، تو انھوں نے اس کی خدمت میں اپنا دیوان ارسال کیا، اس حوالے سے اپنے تقریباً ہم عمر شاگرد اور دوست تفتہ کو ۱۰ر دسمبر ۱۸۵۲ء کے محررہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''جے پور کا امر محض اتفاقی ہے، بے مقصد و بے فکر درپیش آیا ہے۔ ہوسنا کا نہ اُدھر متوجہ ہوا ہوں، بوڑھا ہو گیا ہوں، بہرا ہو گیا ہوں، سرکار انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا۔ رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبا لگ گیا ہے، کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا، ہاں مگر استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں کچھ آپ فائدہ اٹھاؤں، کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کر دوں، دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی

ہے۔''[۳۳]

پروفیسر کرار حسین نے ابواب پر بھاری ایک جملہ لکھا:

''۔۔۔تین ماہ بعد داغ رسوائی اور چشم بینا لے کر قیدِ فرنگ اور فریب کشمکش سے ایک ساتھ آزاد ہوئے۔''[۳۴]

غالب کے سوانح نگاروں اور اس موضوع پر لکھنے والوں میں شیخ اکرام نے واقعہ اسیری کے مضمرات کو جس خوبی سے سمجھا اور بلاغت سے بیان کیا، یہ انھی کا حصہ ہے:

''۔۔۔تیسرا واقعۂ قید جس سے جاگیرداری کا طلسم درہم برہم ہوا۔شعروادب جوان کی مادّی زندگی میں ضمنی حیثیت رکھتے تھے، نان خوردنی کا ذریعہ ہو گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خیالات میں ایک داخلی انقلاب برپا ہوا۔۔۔قید کے رنج وغم کا ماحصل فقط آنسوؤں کی قطار نہ تھی اُس کے عملی نتائج بھی بہت تھے، ایک تو یہ کہ مرزا کی جاگیرداری کا وہ طلسماتی (بلکہ کاغذی) محل جسے وہ اپنے رکھ رکھاؤ، سلیقے اور کاردانی سے برقرار رکھ رہے تھے، دھم سے زمین پر آ گرا۔انھوں نے ابھی جاگیرداری اور نوابی کی وضع داری قائم رکھی تھی، شاید یہ امید تھی کہ انگریز اور ہندوستانی دوستوں کی مدد سے کسی ریاست میں کوئی معزز جگہ مل جائے لیکن قید کی ذلت ورسوائی نے یہ سارا طلسم درہم برہم کر دیا۔۔۔واقعہ قید نے غالب کے رئیسانہ خواب اور خاندانِ لوہارو کی قرابت کا رکھ رکھاؤ قائم رکھنے کے ارمان ختم کر دیئے۔۔۔واقعہ قید کے داخلی نتائج اس سے بھی اہم تھے اب تک مرزا کی روحانی زندگی ایک مسلسل کشمکش کی تھی۔اس ''آویزش بخت وزم وطبع جواں'' میں مرزا کو کامرانی تو جیتے جی نصیب نہ ہوئی مگر انھوں نے ہمت بھی نہ ہاری۔ غالب کی شاعری (اور زندگی) کا ایک نہایت دلچسپ اور جرأت آفریں پہلو ان کی مسلسل نبرد آزمائی [Resilience]، گر گر کے اُٹھنا اور ٹھوکریں کھا کھا کے سنبھلنا ہے، لیکن واقعہ قید نے مرزا کی کمر توڑ دی۔سعی وکوشش تو اب بھی انھوں نے ترک نہ کی لیکن اب انھیں احساس ہو گیا کہ سب باتیں انسانی بس کی نہیں اور انسانی زندگی میں ایسے مرحلے آ جاتے ہیں جب قضا وقدر کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑتے ہیں۔۔۔اب ان کے کلام میں تسلیم ورضا کے مضامین زیادہ آنے شروع ہوئے، خیالات میں توازن وقرار آ

گیا اور اضطرار و بے قراری کی جگہ عارفانہ رواقیت نے لے لی۔ ان داخلی تبدیلیوں کا ایک عملی نتیجہ یہ تھا کہ اب مرزا جاگیرداری کے دعاوی سے کنارہ کش ہو گئے تو دوسرا یہ تھا کہ اپنے ادبی نصب العین یعنی اُردو کے بجائے فارسی میں اظہار خیال میں شکست تسلیم کر لی اور دربار سے وابستہ ہو کر اُردو میں شعر گوئی اور پھر نثر نگاری شروع کی لیکن ان داخلی تبدیلیوں کا اصل عکس ان کے درباری دور کے اُردو کلام، دورِ غدر کے بعد کے اُردو خطوط میں دیکھنا چاہیے۔۔۔ انھوں نے نروان دہلی کی کال کوٹھری میں اپنوں اور غیروں کی بے گانگی دیکھ کر حاصل کر لیا تھا، غدر کے ہنگامہ سے ان کا توازن تہہ و بالا نہیں ہوا۔'' [۳۵]

واقعۂ اسیری پر غالب کا براہ راست شعری ردِعمل ترکیب بند ہیت میں سات بندوں پر مشتمل (ہر بند میں بارہ اشعار) ایک لافانی فارسی نظم ہے، جسے بالعموم ''حبسیۂ غالب'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چوراسی اشعار پر مشتمل یہ ترکیب بند جس کی توصیف میں حالؔی سے لے کر اب تک ہر غالب شناس رطب اللسان ہے، فارسی نظم کی تاریخ میں ایک شہ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا ہر شعر کیفیت اور تاثیر کی شدت کا حامل ہے۔ مالک رام کے خیال میں]

''قید خانے میں جو ترکیب بند انھوں نے لکھا ہے جسے ہم موضوع کی مناسبت سے اسیریہ کہہ سکتے ہیں وہ فارسی نظم کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ ہے اسلوبِ بیان اور سوز و گداز، شدتِ جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ خاقانی کے حبسیہ سے کسی طرح کم نہیں بلکہ بعض مقامات پر یقیناً اس سے بڑھ گیا ہے۔'' [۳۶]

حالی کی شہادت جسے سب نے نقل کیا، کے مطابق مرزا کے عزیزوں اور دوستوں نے کلیاتِ فارسی میں اس نظم کو شامل نہیں ہونے دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ ''اس نظم کی اشاعت سے غالب کی قید ہمیشہ کے لیے منظر عام پر آ جائے گی۔۔۔ غالب کے دوستوں اور عزیزوں کی غلط اندیشی پر تعجب ہوتا ہے کہ قید کے واقعے کو چھپانے کے اہتمام میں انھوں نے غالب کی ایک بہترین نظم کو ضائع کرنا پسند کیا۔'' [۳۷]

کلیات کی باقیات کو غالب نے ایک مختصر سے مجموعے سبد چین میں جمع کیا، اس میں انھوں نے حبسیہ کو بھی شامل کیا۔

''اس حبسیہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنہائی اور اسیری کی اذیت سے زیادہ غالب کو

رسوائی و ذلت کی جراحتوں کا احساس تھا۔ اس سانحہ نے انھیں بے پناہ متاثر کیا تھا۔ دُکھ درد، تنہائی اور ذلت کے احساس سے اُن کا دل خون ہو گیا تھا۔ تاہم اس حبسیہ میں بے ساختگی کے باوجود جو تخیلی بلند پروازی اور فنی پختگی ہے وہ اس بات کا پختہ ثبوت ہے کہ وہ اعصابی تشنج پر قابو پانے کی قدرت رکھتے تھے۔ اس نظم میں بھی درد و غم کی ایک تہہ نشین موج کے باوجود ان کی وسیع المشربی، شوخی فکر اور شگفتگی بیان کے نقوش جا بجا ملتے ہیں۔'' [۳۸]

ذیل میں ہم اس حبسیہ کے منتخب اشعار کا ترجمہ کرنے کی سعی کرتے ہیں:

بند اوّل: (۱) میرے غم دل نے پردہ دری کرتے ہوئے فریاد و فغاں کو ساز بنا لیا ہے (اس لیے) چاہتا ہوں کہ زنداں سے گفتگو کا آغاز کروں۔ (۲) میں اس انداز سے نغمہ ریزی کرنا چاہتا ہوں کہ مضراب سے خون ٹپکنے لگے۔ (۳) تباہ حالی کے باوجود دنیا میں مے خانہ تعمیر کرنا چاہتا ہوں، حالتِ اسیری میں بھی شعر کے ذریعے معجزے دکھا سکتا ہوں۔ (۷) اے یارِ دیرینہ یہاں تشریف فرما نہ ہونا کیوں کہ یہ ممکن نہیں کہ میں تمھاری دستک کے جواب میں دروازہ کھول سکوں! (۸) ہائے مقدر! کہ مقدر کا اہلِ خرد سے گلہ کرنے پر ہم پسِ زنداں ہو جاتے ہیں۔ (۱۰) اے گروہِ اسیراں، شہر میں قحطِ وفا ہے (اور) میں تمھیں اپنا ہم راز اور ہمدم بنا رہا ہوں۔ (۱۲) میری اسیری دائمی تو نہیں لیکن دنیا سے کسی خوش دلی کی اُمید (بعد از رہائی) نہیں۔

بند دوم: [اس بند کے پہلے تین شعر حد درجہ اہمیت کے حامل ہیں کہ غالب نے تاریکی زنداں سے (شاید پہلی مرتبہ) لال قلعے کے ایوان میں جانے کی آرزو کی۔ تفصیل آگے]

(۱) شمع ہر رنگ میں جل جاتی ہے، اچھی (اور خوش نصیب) شمع وہ، جو ایوانِ شاہ کے در پر جلے (۲) میری عود کو مت پھونکو اور اگر جلانا ہی ہے تو بادشاہ کے آتش دان میں جلاؤ! (۳) بے رحم دشمن نے میرا گھر جلا دیا افسوس! اسے تو (بادشاہ کی) خواب گاہ میں برنگ شمع جلنا چاہیے تھا۔ (۴) میں وہ خستہ ہوں کہ اگر اپنا زخمِ جگر دکھاؤں تو کیا ہندو کیا مسلمان سب کے دل میری محبت (ہمدردی) میں جلنے لگیں (۵) میں وہ (کم نصیب) قیس (عاشق) ہوں کہ اگر لیلیٰ میری جانب آئے تو اس کا محمل (میرے) حدی خواں کی آواز سے جل جائے۔ (۶) اسیری میں (بھی) میرا تن دشمنوں کی کثرت سے لرزاں ہے اور میرا دل در دِاندوہِ اسیراں سے جلتا ہے۔ (۱۰) ہائے زنداں! کہ یہاں شبِ تاریک میں بھی کوئی روشنی نہیں، سوائے اُن خوابوں (نیندوں) کے جو پہرے داروں کی آنکھوں میں جلتے ہیں۔

بند سوم: (۱) پاسبانو! اکٹھے ہو جاؤ (بہر استقبال) اور دروازۂ زنداں کھول دو کہ ہم آتے ہیں۔ (۳) مجھے راستہ معلوم نہیں، اور تمھاری کثرت مجھے ڈراتی ہے، مجھے دور سے ہی راستہ دکھاؤ کہ ہم آتے ہیں۔ (۴) تسلیم و رضا کے راستے پر چلنے والا کبھی درشت نہیں ہوتا، (پھر) تم کیوں سخت گیری کرتے ہو، میں آ تو رہا ہوں!۔ (۶) (اپنے گھر کی) زمین کے گالوں پر میرا تازہ لہو چھڑکو اور (یوں) گھر کی رونق کو بڑھا لو کہ ہم آتے ہیں۔ (۸) ہاں! پیارو ہم اس کلبۂ (حزیں و تاریک) میں اقامت گزیں ہوں گے (لہذا) اپنے بخت پر ناز کرو کہ ہم آتے ہیں۔ (۱۰) چوں کہ میرا آئین سخن سرائی اور خرد افروزی ہے، میرے لیے نغمہ سرائی کرو کہ ہم آتے ہیں۔ (۱۲) میری بدنامی (کے ڈر) نے اپنوں کو بھی بے گانہ کر دیا ہے، (اس لیے) غیر میری ناکامی کا غم کھا کر کیا نہال ہوں گے!

بند چہارم: (۱) آج بھی (گزرا ہوا) کل ہے کہ آفتاب قبلے (مغرب) کی سمت سے برآمد ہو رہا ہے۔ (۳) میری سرگزشت سے رنج و الم پیدا ہوتا ہے اور میری سرنوشت سے خوف و خطر جنم لیتا ہے۔ (۵) میری خستگی اور گرفتاری، پہرے داروں کا اختیار نہیں۔ یہ تو قضا و قدر کی جانب سے اس پر مامور ہوئے ہیں۔ (۶) مجھے خستہ کر کے، میرے ہنر کو ضائع نہ کرو کہ یہی خستگی تو میرے عارضِ ہنر کا غازہ ہے۔ (۸) آسمان ایک گراں مایہ شخص کو زنداں میں دیکھنا چاہتا ہے (اس لیے کہ وہ) یوسف زلیخا کی قید سے باہر آ گیا ہے! (۹) آج کی رات میری پلکیں یہ خون کہاں سے لائیں! یہ گرم خون میرے زخم جگر سے آیا لگتا ہے۔ (۱۰) میں غم کے سبب خوں نوشی کیوں کروں کہ میری غم خواری کے لیے رحمت خداوندی بشر کے لباس میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ (۱۱) ایک امیرِ شہر کے پُرسش احوال سے میرا رتبہ میری نظروں میں بڑھ گیا ہے۔ (۱۲) مصطفیٰ خان (شیفتہ) کہ اس واقعہ غم میں میرا غم خوار ہے (اس لیے) مر بھی جاؤں تو کیا خوفِ مرگ کہ میری موت پر رونے والا ہے۔

بند پنجم: (۳) میں تو لاچار ہوں! لاچار! صاحبِ وقار ہونے کا دعویٰ کہاں! قید (خانہ) (پہلے ہی) سخت ہے، اسے (مزید) گرم نہیں کرنا چاہتا! (۴) میں تو قید سے خوش ہوں کہ فکرِ معاش سے آزاد ہو گیا ہوں، کوتوال کے ہاتھوں نان و جامہ مل جاتا ہے۔ (۶) اے اللہ معانی کے یہ موتی جو میں بکھیرتا ہوں، کہاں سے آتے ہیں۔ میرا تن قید ہے (تو کیا) زبان تو آزاد ہے! (۷) ہر شخص قیدِ گراں (رنج اسیری) میں روتا ہے اور اگر نہیں روتا تو وہ میں ہوں، میں تو خود پر روتا ہوں کہ میں خود پر گراں ہوں۔ (۸) مصیبت زدہ کے لیے خوش طبعی اک طرفہ رنج ہے کہ وہ قید میں دوسروں کے دکھ دیکھ کر رنجیدہ ہوتا ہے۔ (۱۱) قید کی مدت (چھ ماہ) اگر میری نظر میں ہے تو خون دل کو مژگاں سے یوں بے

مول کیوں بہایا جائے۔(۱۲) میں کوئی بچہ ہوں کہ قید سے رہائی چاہوں! میرا ذوق تو بیڑیوں کے (کسی نہ کسی) سلسلے میں گرفتار ہونا چاہتا ہے۔

بندششم: (۱) میں وہ نہیں جسے اس (گرفتاری واسیری کے) سلسلے میں بے آبروئی کا احساس نہ ہوتا ہو، کیا کروں قضاوقدر سے جنگ کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔(۳) راز دانائی جاننے والوں کے لیے ہمیشہ کی رسوائی، بڑی بلا ہے، ورنہ قیدِ فرنگ سے ملنے والے آزار کا کوئی غم نہیں۔(۶) میں آئینہ ہوں اور یہ حادثہ اسیری اس آئینہ پر زنگ اور مجھ میں زنگ آلود ہونے کی بدنامی کو سہارنے کی ہمت نہیں (۷) آہ وہ لمحہ! کہ جب زنداں سے پروانہ آیا (اور) مجھے ایک ایسے دائرے میں پکڑا، کہ میں دم بھی نہ مار سکا۔(۹) دشمنوں کے ظلم تو رہائی کے بعد دل سے دھل جائیں گے لیکن دوستوں کی ملامت زخمِ تیر سے بڑھ کر ہے۔(۱۲) میرے قلم کی آواز (لمحہ تخلیق) ہی میرے من کی مستی وسرخوشی کا ذریعہ ہے، اس قیدِ گراں میں میری سبک دستی (مہارت، مشاقی) ملاحظہ ہو!

بندہفتم: (۱) دوستو! دل میں مقیم اور آنکھوں سے نہاں دوستو! تم غالب غم زدہ کے لیے روح اور روحِ رواں ہو (۲) پروردگار کا شکر ہے کہ تم عیش ونشاط میں ہو اور شان وشوکت کے حامل بھی۔(۳) تم صاحب نظر ہونے کے حوالے سے سحر طراز بھی ہو اور سلطنت شاعری میں مسندِ بادشاہت پر فروکش بھی ہو۔(۶) میں خون میں لت پت سو رہا ہوں مگر دیکھ رہا ہوں، تم بھی دیکھو، میں جگر خستہ ہوں مگر جانتا ہوں، تم بھی (مجھے) جانو!(۷) ہمارے اور تمھارے درمیان مہر ووفا کا معاہدہ ہے، میں برابر اس کی پابندی کر رہا ہوں، دوستو تم بھی اس کی پابندی کرو۔(۱۰) دوستو! اگر تم (میری رہائی میں) چارہ گری نہیں کر سکتے تو دعا کافی ہے، آقا! اگر دل نہیں ہے تو زبان تو ہے!(۱۱) یہ سات بند جو میں نے زنداں میں لکھے ہیں، تم انھیں لکھو، دیکھو اور پڑھو۔(۱۲) جب میں نہیں رہوں گا تو ہر بزم میں مجھے یاد کرو گے، مجھے امید ہے کہ بزم سخن میں تو مجھے یاد کرو گے ہی! (ترجمہ راقم السطور۔ متن، ''غالب'' غلام رسول مہر)

اسیری اور اسیری کی رسوائی بلاشبہ غالب کو خون کے آنسو رُلا گئی، لیکن اُردو شاعری کے لیے یہ سانحہ، خیر مستور ثابت ہوا۔ غالب کا ادبی نصب العین بدل گیا۔ یہ تبدیلی مخصوص حالات میں ان کی ضرورت تھی، اسے فارسی شعر گوئی میں اعترافِ شکست قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ سمجھنا درست ہوگا کہ ایک تو وہ گزشتہ اٹھارہ، انیس سال میں فارسی میں اتنا کچھ کہہ چکے تھے کہ فارسی شعر میں اُن کے مسلم الثبوت استاد ہونے کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ ۱۸۴۵ء میں ''مے خانہ آرزو سرانجام'' (دیوانِ فارسی) مطبع دارالسلام دلّی سے شائع ہوا جب کہ یہ دیوان ۱۸۳۵ء میں مرتب ہو

چکا تھا۔[۳۹] باقاعدہ فارسی گوئی کا آغاز ان کے سفر و قیام کلکتہ کے دنوں میں ہوا۔ ''گل رعنا'' کی ترتیب و تدوین (۱۸۲۸ء) تک غالب کے فارسی سرمائے میں ۴۵۵ اشعار ملتے ہیں اور یہ انتخاب نہیں، بلکہ تمام کلام ہے اور اس میں تمام اصناف کے اشعار شامل ہیں جن کی تفصیل مالک رام کے مطابق یہ ہے۔۔قصیدہ:۵۴ شعر، قطعات:۴۴ شعر، مثنوی ۱۰۴ شعر، غزلیات:۲۵۳ شعر، کل اشعار ۴۵۵

> ''گویا مجموعی طور پر ۴۵۵ میں سے ۳۴۹ شعر اس سفر کی یادگار ہیں اور ۱۰۶ شعر ماقبل کے کلام سے لیے گئے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے اس سفر یا دوسرے لفظوں میں تیس برس کی عمر سے پہلے مرزا نے فارسی پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ اب تک وہ بالعموم اُردو ہی میں لکھتے رہے تھے، فارسی سے انھیں زیادہ شغف کلکتہ کے ماحول سے پیدا ہوا۔''[۴۰]

آیئے اب یہ دیکھیں کہ فارسی گوئی کے اس انیس سالہ دور میں اُردو شعر پر اُن کی شفقت کس قدر رہی اور واقعہ قید کے بعد جب ''عندلیب عجم'' پھر سے ''طوطی ہندوستان'' ہوئے تو کیا صورت ہوئی۔ ۱۸۰۷ء سے ۱۸۲۸ء تک دو دہائیوں میں غالب کے کل ۲۸۷۷ اُردو اشعار دستیاب ہوتے ہیں، جب کہ متداول دیوان میں ان میں سے ۹۹۹ اشعار شامل ہیں۔ ۱۸۲۸ء سے ۱۸۴۷ء کی دو دہائیوں میں کل اشعار ۱۷۸ دستیاب ہوتے ہیں اور متداول کے لیے ان کا انتخاب ۱۵۹ اشعار ہیں۔ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۷ء کی ایک دہائی میں کل اُردو اشعار کی تعداد ۸۸۴ ہے اور متداول دیوان میں ۶۳۸ شعر شامل ہوئے۔ دورِ ابتلا کے بعد سے پانچ (۱۸۵۲ء تک) سالوں میں کل اشعار ۴۴۴ اور دیوان کے لیے منتخب اشعار ۳۸۴ ہیں۔[۴۱]

مذکورہ اعداد و شمار غالب کی اُردو شعر گوئی کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کو بخوبی ظاہر کرتے ہیں، اس مراجعت کا سبب شاعر کی اپنی ذات اور اپنے احباب کے ساتھ مکالمے کی جذباتی احتیاج کے بڑھ جانے میں بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ''رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور''۔۔۔ باہر کی دنیا سے ابلاغ میں رخنہ پڑا تو شاعر نے داخلی دنیا میں مکالمے کو زیادہ کر دیا، یہی وجہ ہے کہ غالب کے اس دور کے جس قدر شعر قاری سے ہم کلام اور یوں زباں زد ہوئے کسی اور دور کے اشعار نہیں ہوئے، لیکن جس وجہ سے اُردو شعر گوئی غالب کے لیے از بس کہ ضروری ہوئی وہ قلعہ معلیٰ سے وابستگی کی شدید ''ضرورت'' قرار پاتی ہے۔ اس ضرورت کی نوعیت کو محض معاشی سمجھنا درست نہیں۔۔۔ ''شعر و ادب جو ان کی مادّی زندگی میں محض ضمنی حیثیت رکھتے تھے، نان خوردنی کا ذریعہ بن گئے'' (اکرام) بلاشبہ اب تک غالب نے اپنے ہنر سے براہ راست حصولِ معیشت کے بارے میں اس طرح نہیں سوچا

تھا، یہ الگ بات کہ انھوں نے مختلف مواقع پر عمالِ حکومت کی مدح میں کبھی رسماً اور کبھی غیر رسمی طور پر (بیشتر فارسی میں) کچھ کہہ کر فوری مقصد حاصل کرنا چاہا، لیکن غالب کبھی بھی کسی سرکار سے بطور شاعر وابستگی کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ اب دربار سے وابستہ ہونا چاہا اور ہر قیمت پر۔ یہ خواہش وسائل آمدنی بڑھانے سے کہیں زیادہ بے آبروئی کے اُس داغ کو دھونے کی کوشش تھی جس نے دلّی کے جاگیرداری سماج میں اُن کے سماجی مقام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا تھا۔

غالب کی پوری زندگی شاہد ہے کہ وہ جتنی بڑی غلطی کرتے تھے، حالات بدل جانے پر اُسی قدر شد و مد سے اُس کی تلافی کی سعی کرتے تھے، شکست کے بعد ستانے کی بجائے سرگرم ہونے کا رجحان ان کی زندگی اور شاعری ہر دو کا خاصہ ہے۔ یوں لگتا ہے کہ غالب نے زنداں کی کال کوٹھری میں جو نروان حاصل کیا اس کا اہم ترین پہلو یہی تھا کہ بعد از رہائی دربارِ شاہ پر صدا دی جائے۔ اس منصوبے کا آغاز انھوں نے حبسیہ کی تخلیق کے زمانے میں ہی کر دیا۔ جب دوسرے بند کے پہلے تین اشعار بین السطور میں اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ اب وہ سلطان کی انگیٹھی میں اپنے عود کی لکڑی جلانا چاہتے ہیں اور اپنی شمع (سخن) کی روشنی سے اُس کے ایوانوں کو منوّر کرنا چاہتے ہیں۔ کسی اور سوانح نگار نے حالی سے مروی اس بیان کو اہمیت نہیں دی کہ غالب قید سے رہا ہونے کے بعد اپنے گھر جانے کی بجائے میاں کالے صاحب کے مکان میں آ کر رہے تھے اور یہیں وہ لطیفہ واقع ہوا کہ ''کون بھڑوا رہا ہوا ہے، پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں۔'' ان کے اس اقدام کی وجہ حالی کے ان جملوں میں تلاش کی جا سکتی ہے:

> ''حضرت محمد نصیرالدین عرف میاں کالے صاحب بہادر شاہ مرحوم کے شیخ اور مولانا فخرالدین قدس سرہٗ کے پوتے تھے۔ مرزا مدت تک اُن کے مکان میں رہے، وہ مرزا سے نہایت محبت رکھتے تھے اور انھیں کی تقریب سے قلعہ میں تعلق پیدا ہوا تھا۔'' [۴۲]

ظاہر ہے بادشاہ اور اہلِ قلعہ کے پیر اور معاشرے میں ایک محترم روحانی شخصیت سے اس ارتباط نے غالب کی ''ڈرائی کلینگ'' میں بھی مدد کی اور غالب کی دروازۂ شاہ پر صدا میں اپنے عصائے پیری کی ٹھونک شامل کر کے اُس در کو جس پر غالب کے لیے بہت گھاس اُگ گیا تھا، صاف کروانے اور کھلوانے کو بھی ممکن بنایا۔ اس حوالے سے بعد از ۱۸۴۷ء کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ غالب اور قلعہ معلّٰی کے مابین تعلقات کے ماضی پر ایک نگاہ ڈال لی جائے۔

غالب کے دادا مرزا قوقان بیگ ۱۷۵۰ء کے لگ بھگ سمرقند سے ہندوستان وارد ہوئے تو ابتداً لاہور میں نواب معین الملک (متوفی ۳؍نومبر ۱۷۵۳ء) کے ملازم ہوئے۔ وسط ۱۷۵۴ء تک وہیں رہے پھر دلّی پہنچے اور شاہ عالم کی شہزادگی (۲۴؍اپریل ۱۷۵۶ء) کے زمانے میں شاہی ملازم ہوئے۔ عہد نجف خان (۱۷۷۱ء) میں، اس سرکار سے وابستہ ہوئے اور پھر مستعفی ہوکر مہاراجہ جے پور کے ہاں نوکری کرلی اور یوں یہ خانوادہ آگرے منتقل ہوگیا اور جب غالب آگرے سے ۱۳-۱۸۱۲ء میں دلّی آئے تو وہ پندرہ برس کے، میاں ذوق تئیس اور بہادر شاہ ظفر سینتیس سال کے تھے اور غالب ابھی آگرے میں دس سال کے ہوں گے جب دلّی میں ۱۸۰۸ء میں ذوق، ولی عہد ظفر کے چار روپے ماہانہ مشاہرے پر اُستاد ہوگئے تھے۔ اس لیے جہاں ماہرینِ غالب کا بے دھیانی میں یہ سمجھنا کہ غالب ایسے نابغہ روزگار کے ہوتے، ظفر نے ذوق ہی کو ملک الشعرائی کیوں عطا کیے رکھی، درست نہیں۔ یہ اتفاق حادثہ پیدائش کا نتیجہ تھا، اور اس میں ظفر کی ''بد ذوقی'' سے زیادہ ''شائبہ خوبیِ تقدیر'' کارفرما تھا۔ لہذا غالب ابھی لڑکے ہی تھے کہ ظفر و ذوق میں نسب کے تمام تر فرق کے باوجود مکمل ذہنی ہم آہنگی اور جذباتی وابستگی پیدا ہوچکی تھی۔ ذوقؔ کے ذہنی معیار اور سماجی حیثیت بھی ایسی تھی کہ وہ تمام عمر استادِ شہہ ہونے پر تہہ دل سے فخر کرسکتے تھے اور انھوں نے کیا بھی۔ سبھی نقادوں نے لکھا ہے کہ ذوقؔ کو بادشاہ سے واقعی محبت بلکہ عقیدت تھی جب کہ ۱۸۴۷ء سے قبل غالب استادِ شہہ ہوکر ملک الشعرائی کی تمنا کر بھی رہے تھے تو کم از کم اس کا اظہار نہیں کر رہے تھے۔

۴؍جولائی ۱۸۵۰ء سے قبل غالب کا قلعہ سے کوئی باقاعدہ تعلق نہیں تھا۔ کبھی عید، بکرعید یا شادی بیاہ کی تقریب میں ان کے قصیدہ یا قطعہ کہہ کر لے جانے کا ذکر مالک رام نے کیا لیکن ایسے کلام کی نشان دہی نہیں کی اور نہ ایسا کلام غالب کی کلیات اُردو یا فارسی میں ملتا ہے۔ اس لیے خلیق انجم کا یہ کہنا درست ہے:

> ''دربارِ شاہی سے غالب کے تعلق کی اوّلین شہادت وہ قصیدہ ہے جو انھوں نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں کہا تھا، قصیدے کا مطلع ہے:
>
> دریں زمانہ کہ کلک رصد نگار حکیم
> ہزار و دو صد و پنجاہ راز در تقویم
>
> گویا غالب نے ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں یہ قصیدہ کہا تھا۔'' [۴۳]

غالب، ذوق تو تھے نہیں کہ صرف عقیدت کی بنا پر قصیدہ کہتے، اکبر شاہ ثانی کی مدح سے بھی شاید اتنی غرض نہ

ہو جتنا اس بات سے کہ اُن دنوں اکبر شاہ کے ولی عہد کا روایتی مغل جھگڑا چل رہا تھا۔ بادشاہ سلامت سب سے بڑے اور حق دار ابوظفر سراج الدین کی بجائے پہلے شہزادہ جہانگیر اور اُس کی موت کے بعد چوتھے نمبر والے شہزادہ سلیم کی ولی عہدی کے خواہش مند تھے۔

> ''اکبر شاہ ثانی مستقل کوشش کر رہے تھے کہ بہادر شاہ ظفرؔ کو اُن کے حق سے محروم کر دیا جائے، اس سلسلے میں انھوں نے ظفر پر یہ الزام لگایا کہ شاہ عالم کے زمانے میں ظفر نے بادشاہ کی ایک بیگم کی عصمت دری کی تھی۔''[۴۴]

غالب نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر یہاں بھی داؤ لگایا انھوں نے سوچا کہ بادشاہ جو چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے لہٰذا انھوں نے مذکورہ قصیدے میں شہزادہ سلیم کی بھی مدح کی بلکہ یہ ثابت کیا کہ اس شہزادے کی تربیت اس انداز سے کی گئی ہے کہ مغل تاج و تخت کا حقیقی وارث ہونے کا اہل قرار پاتا ہے۔ اس واقعے کے کچھ ہی دن بعد انگریزوں نے ابوظفر کے ولی عہد ہونے کا اعلان کر دیا اور اس کے تین سال بعد ۲۸ ستمبر ۱۸۳۴ء کو اکبر شاہ ثانی کا انتقال ہوا اور اگلے ہی دن سراج الدین ابوظفر، بہادر شاہ کے لقب سے سریر آرائے تخت مغلیہ ہوئے اور یوں ایک قصیدے کی ''سیاسی تخلیق'' کر کے انھوں نے جو سرمایہ کاری کی تھی وہ ہمیشہ کے لیے ڈوب گئی۔

ادبی تواریخ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق غالب کی طرف سے ذوقؔ پر پہلی چوٹ ان کے ۱۰۹ اشعار پر مبنی فارسی قطعے میں ملتی ہے جس کے یہ دو شعر بہت معروف ہیں:

نیست نقصاں، یک دو جزو ست از سواد ریختہ کان وژم برگے ز نخلستاں فرہنگ من است
فارسی بیں تا ببنی نقش ہائے رنگ رنگ بگزر از مجموعہ اُردو کہ بے رنگ من است

اور آخری مصرع میں غالب نے واضح کر دیا کہ وہ اُس زبان کا شاعر ہی نہیں، جس زبان کا ''خاقانی ہند'' ذوقؔ ہے۔

ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

> ''غالب اکثر ذوق دشمنی میں یہ بھول جاتے تھے کہ ذوق کو استاد شہہ ہونے کا شرف حاصل ہے اُن کی اُردو شاعری کا مذاق اڑانے کا مطلب ظفر کی شاعری کا مذاق اڑانا ہے، انھیں جاہل بتانا خود بادشاہ کو جاہل ثابت کرنے کے مترادف ہے۔ ظاہر ہے غالب کے اس قسم کے اشعار سے ظفر اور بھی کبیدۂ خاطر ہوتے ہوں گے۔''[۴۵]

غالب اسیری کے سانحے سے قبل بھی قلعہ معلیٰ اور بادشاہ سے تعلق کے اسی شدت سے خواہاں تھے، اس کے

شواہد اُن کی زندگی اور کلام میں یوں عام نہیں ہیں، جس طرح بالعموم سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے غالب اس کے آرزومند ہوں، لیکن ان کا طرزِ عمل شاعری اور زندگی میں ۱۸۴۷ء تک اس طرح کے معزز سماجی مقام کو اپنے سے دور کرنے کا ہے نزدیک کرنے کا نہیں۔ شاید سہرا کہنے کے وقت ان کو خن گستری سے ''قطع محبت'' مقصود نہ ہو۔ لیکن فارسی قطعہ کی حد تک وہ آئین مہرورزی سے بہت دور ہیں اور ان کے لہجے میں مایوسانہ قطعیت دکھائی دیتی ہے۔

وقت ایک سا نہیں رہتا۔ ۱۸۲۷ء میں کلکتہ جاتے ہوئے قیام لکھنؤ کے دنوں میں نائب السلطنت معتمد الدولہ آغا میر سے ملاقات کی جو شرائط رکھیں اور جن کے نہ مانے جانے پر انھوں نے ضرورت مند ہوتے ہوئے بھی ملاقات سے انکار کیا، اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ غالب بطور شاعر کسی دربار میں حاضری دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے بلکہ رئیس زادے اور امیر کی حیثیت میں اپنی شناخت چاہتے تھے۔ تیرہ سال بعد ۱۸۴۰ء میں دلّی کالج میں پروفیسری کو قبول کرنے سے اس لیے انکار کیا کہ سیکرٹری ٹامسن نے گھر سے باہر دروازے پر آ کر استقبال کیوں نہ کیا اور یہ کہ نوکری پہلے سے حاصل عزت اور وقار میں اضافے کے لیے کرنا چاہتے ہیں اور اُس میں کمی انھیں منظور نہیں، حالاں کہ اگر غالب یہ ملازمت اختیار کرتے تو انھیں سو روپے تک مشاہرہ دیا جاتا۔ جاگیردارانہ تصورِ حیات کے ان مزعومات کی مکمل شکست ۱۸۴۷ء میں ہوئی تو انھوں نے لمحۂ فکر شعر کے علاوہ بھی یہی سوچا ہوگا کہ اے کاش زمین پھٹ جائے یا آسمان ٹوٹ پڑے۔ آئین عبودیت کے مطابق انھوں نے حق آرزومندی کو بروئے کار لاتے ہوئے زندہ نہ رہنے اور زندہ رہنے، تو پھر ہندوستان میں نہ رہنے کا سوچا، لیکن حیات کی تلخ ترین کج ادائی پر بھی سبھی عام انسانوں (نچلی سطح پر) کی طرح وہ بھی سوچ سوچ کر رہ گئے اور عمل کی سطح پر جو امکان باقی بچا وہ یہی تھا کہ وہ نہ صرف زندہ رہیں گے بلکہ ہندوستان میں ہی رہیں گے اور وہ بھی دلّی میں، اُسی شہر میں جس میں وہ زنداں بھی تھا، جہاں عزت و ناموس اور شوکت و جاہ کے امکانات خاک میں دفن ہوئے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنی گمشدہ شرافتِ نسب کو پانے اور مرتبۂ خاندان پر لگی سیاہی کو دھونے کے لیے انھیں اُسی دربار میں جانا ہوگا جہاں اُن کا مرتبہ ذوقؔ سے دوسرے درجے کا ہوگا اور وہ کام (ریختہ گوئی) پھر سے شروع کرنا ہوگا جسے وہ اپنے لیے باعث ننگ قرار دے چکے تھے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ قید کے بعد غالب کے کلیات اُردو میں اچانک نشو و بالیدگی ہونے لگتی ہے۔ دیوانِ غالب کا دوسرا ایڈیشن مئی ۱۹۴۷ء میں مطبع دارالسلام دلّی سے شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن کے آخر میں نامعلوم خط میں جو کلام درج ہوا، ماہرین غالب نے اسے ۱۸۴۷ء کے فوری بعد کا کہا ہوا قرار دیا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے سترہ اشعار کا ایک قطعہ ہے، جسے غالب کے قلم سے بہادر شاہ کی مدح میں پہلی

کاوش سمجھنا چاہیے۔اس کا مطلع ہے

اے شہنشاہِ فلک منظر بے مثل و نظیر اے جہاں دارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

مدح کے سات اشعار کے بعد مدعائے ضرورالتحریر یوں نظم کرتے ہیں:

تیری دانش، مری اصلاح مفاسد کی رہین تیری بخشش، میرے انجاح مقاصد کی کفیل
تیرا اقبالِ ترحم، مرے جینے کی نوید تیرا اندازِ تغافل میرے مرنے کی دلیل

مذکورہ اشعار تمام تر سوز و گداز کے ساتھ یہ واضح کرتے ہیں کہ ''عنایتِ شاہ'' کی ضرورت اب غالب کے لیے زندگی اور موت کا معاملہ بن گئی تھی۔

ذوقؔ اور مکتب ذوق سے غالب کے ''ادبی اختلافات'' (جن کی زیادہ تر وجوہ ذاتی تھیں اور آج تک ہوتی ہیں) کو ذہن میں رکھ کر مدح کے سات شعروں میں سے ذیل کا شعر بہت پُر لطف لگتا ہے:

تیرا اندازِ سخن شانہ زلفِ الہام تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

بادشاہ سے التفات کی خواستگاری کے بعد دو شعروں میں (قطعہ در قطعہ) صورتِ واقعہ پر روشنی ڈالتے ہوئے پہلے شعر میں کوتاہ نصیبی کا سبب آسمانِ دشمنی بتایا اور دوسرے میں فریقین کے باہمی روابط کی تاریخ کو دھندلانا چاہا یا یوں کہہ لیں کہ اس بارے میں اپنے ''نظر ثانی شدہ'' موقف کو پیش کیا ہے۔

بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں چرخ کج باز نے تاکا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سر رشتہ اوقات میں گانٹھ پہلے ٹھونکی ہے بن ناخنِ تدبیر میں کیل

غالب سوچتے ہوں گے کہ ۲۵ رمئی ۱۸۴۷ء سے قبل اگر وہ متعلقین قلعہ میں سے ہوتے تو ان کی ''قانون شکنی'' قابلِ دست انداز کوتوال نہ رہتی۔اگر دوسرے مصرع میں ''ناخنِ تدبیر'' کو وابستگیٔ دربار و تعلق شاہ کا کنایہ تصور کریں تو غالب حرف بہ حرف درست ہیں۔

بظاہر یہ قطعہ در مدحِ بہادر شاہ ہے لیکن سترہ اشعار میں سے نصف سے کم یعنی کل سات اشعار میں مدحت شاہ ہے اور باقی دس میں سے چار میں التفات سلطان کی دردمندانہ درخواست، دو میں تاریخ اور تین شعروں میں غالب نے اپنی مدح کی ہے۔قصیدہ نگاری کا یہ غالب کا اپنا انداز ہے، ان تعلیقاتِ شعر میں جو کچھ کہا گیا بلاشبہ سچ ہے:

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

فکر میری، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر　　کلک میری رقم آموز عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق، توضیح　　میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش، تفصیل

ان اشعار میں غالب کا ''رومانی موقف'' کارفرما ہے کہ ہنر اور ہنرور کے لیے سماج کے پاس کوئی رعایت آخر کیوں نہیں ہوتی، اور پھر صاحب ہنر بھی کون؟ غالب۔۔۔ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے!

قبل ازیں دو شعروں میں غالب نے انجاح مقاصد کو موت و زیست کا معاملہ قرار دیا تھا۔ قطعہ کے آخری دو شعر تاکیدِ مزید کے حوالے سے معاملے کی نزاکت کو نہایت تاثیر کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

نیک ہوتی مری حالت، تو نہ دیتا تکلیف　　جمع ہوتی مری خاطر، تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں، خستہ نوازی میں یہ دیر!　　کعبہ امن و اماں، عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

''عقدہ کشائی'' اور ''خستہ نوازی'' میں واقعی دیر ہوئی۔ ۱۸۴۷ء کے بعد تین سال کا عرصہ، بہت زیادہ ہے۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ احسن الاخبار کی شہادت کے مطابق بادشاہ نے سفارشی رقعہ ریذیڈنٹ کے نام لکھا تھا، اگر اُس وقت غالب کے احباب بادشاہ سے سفارش کرانے کے لیے موثر ہوتے تو پھر کالے میاں اور حکیم احسن اللہ خان جیسی ''تگڑی سفارشوں'' کے ہوتے ہوئے غالب کی اشک شوئی میں پونے تین سال لگ گئے؟ اس کے بظاہر دو سبب ہیں، ایک تو وہی جس کا بیان ہوا کہ غالب میں ماضی میں ''بساط سیاستِ سلطنت'' کے مہروں کا رُخ، دور کھڑے ہو کر محض اپنی پھونکوں سے بدلنے کی کوشش کی تھی، استاد شہہ کے ساتھ اور خود شہہ کے ساتھ دلّی کے ادبی محاذ پر بھی جو کچھ ہوتا تھا اُس سب نے مل کر فریقین کے درمیان دوری کی خلیج کو بہت بڑھا دیا تھا۔ دوسری وجہ ذوقؔ کی عمرِ عزیز کے ابھی کئی سال باقی تھے (ذوقؔ نے ۱۵/نومبر ۱۸۵۴ء کو وفات پائی)

> ''ذوق ۱۸۰۸ء سے استادِ ظفر تھے، ان کی موجودگی میں کوئی اور استادِ شاہ اور ملک الشعرا تو ہو نہیں سکتا تھا اور غالب اس سے کم پر قناعت نہیں کر سکتے تھے۔'' [۴۶]

درمیان کا جو راستہ نکالا گیا وہ ظاہر ہے کسی اور صورتِ حال میں غالب کو کبھی بھی قابلِ قبول نہ ہوتا، لیکن کیا کیجیے کہ کھیل میں جیتنے والا غالب مقدر سے ہارا ہوا تھا۔ لہٰذا ۴/جولائی ۱۸۵۰ء کو چھ پارچے اور تین رقم جواہر کا خلعت پہن کر، نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ کے خطابات سے سرفراز ہو کر چھ سو روپے سالانہ مشاہرہ پانے اور اس کے عوض ''مہر نیم روز'' کے نام سے تیموری خاندان کی تاریخ معہ شاعرانہ تخیل (اُردو سے) فارسی میں رقم کرنے لگا۔ اس موقع پر اُس ''ہدیہ تبریک'' کا ذکر ضروری ہے جو غالب اتنی اللہ آمین سے لائے گئے ''دن'' کے موقع پر کہہ کر

لے گئے اور جس کا مطلع ہے:

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کوئی اور ہوتا تو اس موقع پر ایک زوردار قصیدہ کہتا لیکن غالب نے آٹھ شعروں کی غزل میں بادشاہ کی مدح کے ساتھ گوندھی ہوئی توصیف شاعر، بلکہ یوں کہیں کہ ''بادشاہ کے ذکر میں مدح شاعر'' اپنی مظلومیت، یگانہ پن، ''اور کم گناہ گار'' ہونے کے سبب حدِ عقوبت کے طلب گار ہونے کے ساتھ ساتھ ''نوکر نہ ہونے'' کے اعزاز اور نعمت کے گم ہو جانے کا ذکر، سبھی کچھ کر دیا:

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دُعا وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

بہادر شاہ، بادشاہ تو جیسے تھے اور جتنے تھے، سبھی کو معلوم ہے۔ بہر حال یہ اہم ہے کہ لاکھ، سوا لاکھ کے پنشن خوار نے ساڑھے سات سو روپے کے پنشن خوار کے وظیفے میں چھ سو روپے کا سالانہ اضافہ کر دیا اور یوں غالب کی تمام تر ''غالبیت'' کے باوجود اُس بنیادی رشتے کا احترام کیا جو غالب اور بادشاہ میں تھا اور جس رشتے کی موجودگی پر غالب کا اصرار اُن ایام میں بہت بڑھ گیا تھا۔۔۔شاعر ہونا، اصحابِ ورق و قلم ہونا، معانی اور صورتوں کے خالق ہونا، ان رشتوں کا احترام کر کے، دلّی کے سماج اور بہادر شاہ نے ایک اچھے شاعر مگر بدنام شخص کو اس کی تمام تر وسیع المشربی سمیت اپنے پہلو میں جگہ دے کر جس وسیع الظرفی کا مظاہرہ کیا غالب کے طرف داروں کو اُس کی داد ضرور دینا چاہیے۔

بعد از ۱۸۴۷ء کے حوالے سے غالب کا جو کلام تحقیق ہوا اس کی فہرست درج ذیل ہے:

نمبر شمار	غزل کا مصرع	تعداد اشعار
۱-	میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں	۳
۲-	گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا	۳
۳-	ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا	۱۱
۴-	ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا	۸
۵-	یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا	۱۱
۶-	نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	۳

۷-	گھر جب بنالیا ترے در پر، کہے بغیر	۹
۸-	تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو	۷
۹-	تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے	۷
۱۰-	کوئی دن گر زندگانی اور ہے	۶
۱۱-	کوئی اُمید بر نہیں آتی	۱۰
۱۲-	دلِ ناداں، تجھے ہوا کیا ہے	۱۱
۱۳-	حسن مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے	۱۰
۱۴-	شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے	۱۲
۱۵-	ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے	۱۱
۱۶-	ابنِ مریم ہوا کرے کوئی	۱۰
۱۷-	اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے	۹
۱۸-	میں انھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں	۴ [۴۷]

مذکورہ غزلوں کے تمام اشعار غالب نے متداول دیوان (تیسرا ایڈیشن ۱۸۶۱ء) میں شامل کیے سوائے غزل نمبر ۱۵ کا یہ شعر شامل نہیں ہو سکا:

مزہ تو جب ہے کہ اے آہِ نارسا ہم سے وہ خود کہے کہ ''بتا تیری آرزو کیا ہے''

رہائی کے بعد سال، سوا سال کے عرصے میں اٹھارہ غزلیں (کچھ نامکمل سہی) (کل اشعار ۱۳۹) غالب کی ریختہ گوئی کی جانب خصوصی توجہ کو ظاہر کرتی ہیں اور پھر یہ سبھی غزلیں تغزل کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہیں، جو اس بات کی واضح سعی ہیں کہ غالب دلّی کے ادبی منظر نامے پر دو دہائیوں کی گمشدگی کے بعد استادِ ریختہ کے طور پر جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔ یہ وہ ریختہ ہے جو بجا طور پر ''رشکِ فارسی'' کہے جانے کا حق دار ہے۔ ان غزلوں میں اسیری کے حوالے سے غالب کا احساس، فکر اور آرزومندیاں بہت نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو موضوع ان غزلوں میں، سب سے زیادہ اُبھرا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ قلعہ معلّٰی سے وابستگی کی شدید خواہش اور بادشاہ سے ہم کلامی کی آرزو کنائے اور ایمائیت کے باوجود بہت واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔

غزل کا نمبر شمار

۱- درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں ۱
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

۲- بعد یک عمر ورع، بار تو دیتا بارے ۲
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

۳- قید میں ہے تیرے وحشی کو وہی زلف کی یاد ۳
ہاں، کچھ اک رنجِ گراں باری زنجیر بھی تھا

۴- دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے ۴
بارے آشنا نکلا، ان کا پاسباں اپنا

۵- دردِ دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں ″
اُنگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا

۶- گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا ″
ننگ سجدہ سے میرے، سنگ آستاں اپنا

۷- تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو ″
دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زباں اپنا

۸- یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ۵
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غم گسار ہوتا

۹- یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ ″
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

خواجہ حالی کی روایت کے معتبر نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں:

''سنا ہے جس وقت یہ غزل مرزا نے بادشاہ کو سنائی تو بادشاہ نے مقطع سن کر کہا ''بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے۔''۔۔۔مرزا نے کہا ''حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں'' مگر یہ اس لیے ارشاد ہوا ہے کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔''[۴۸]

غزل نمبر

۱۰- گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر ۷
جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر

۱۱- کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقت سخن //
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

۱۲- بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات //
سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

۱۳- غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض //
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر، کہے بغیر

۱۴- تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو ۸
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

۱۵- کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں //
مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

۱۶- غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں //
دنیا ہو، یا رب، اور مرا بادشاہ ہو

۱۷- کوئی اُمید بَر نہیں آتی ۱۱
کوئی صورت نہیں نظر آتی

۱۸- ہم ہیں مشتاق اور وہ بے زار ۱۲
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

۱۹- ہم کو ان سے وفا کی ہے //
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

۲۰- جان تم پر نثار کرتا ہوں //
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

۲۱- میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ //
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

۲۲- بے طلب دیں تو مزا اِس میں سوا ملتا ہے ۱۳
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

۲۳- دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض //
اِک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

۲۴- خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز //
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

تیرہ اشعار کی ایک (نمبر شمار ۱۴) پُرکار اور کیفیت کی حامل غزل کے چار شعروں میں بادشاہ کی مدح کی، پھر اچانک احساس ہوتا ہے کہ غزل کے فن کے ساتھ یہ ناانصافی ہے:

۲۵- میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں ۱۴
یہ بھی تیرا ہی کرمِ ذوق فزا ہوتا ہے

دوسرا مصرع ہجو ملیح کا حامل ہے، جس کی تائید اگلے ہی شعر (جو مقطع ہے) سے یوں ہوتی ہے:

۲۶- رکھیو غالبؔ، مجھے اس تلخ نوائی میں معاف ۱۴
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

۲۷- ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے ۱۵
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

۲۸- رہی نہ طاقت گفتار اور اگر ہو بھی //
تو کس اُمید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

۲۹- ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا //
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

اس غزل کے بارے میں خلیق انجم نے لکھا:

''غالب ۴ر جولائی ۱۸۵۰ء کو خاندانِ مغلیہ کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے۔ اس سے تھوڑی

مدت بعد انھوں نے ایک غزل کہی۔۔۔ابھی تک کسی نقاد اور محقق کی نظر اس طرف نہیں گئی کہ ان چھ اشعار میں غالب نے ظفؔر اور ذوقؔ سے اپنے تعلقات کی پوری داستان بیان کی ہے۔''[۴۹]

خلیق انجم صاحب نے اس غزل کے ۱۸۵۰ء کے بعد کی تخلیق ہونے کے دو ثبوت پیش کئے ایک تو یہ کہ یہ غزل دیوانِ غالب کی اشاعت اوّل (۱۸۴۱ء) اور اشاعت دوم (۱۸۴۷ء) میں شامل نہیں، اس کا جواب یہ کہ یہ تمام تر کلام جسے ہم اسیری کے واقعہ کے حوالے سے غالب کے ردِعمل کے طور پر دیکھ رہے ہیں، دیوان کی دونوں اشاعتوں میں شامل نہیں، اُن کی دوسری دلیل یہ کہ۔۔۔''غالب کے لیے اس مفہوم کا مقطع اُس وقت تک کہنا ممکن نہیں تھا جب تک کہ وہ خود ظفؔر کے ملازم نہ ہوتے، کیوں کہ بادشاہ کے اُستاد پر اتنی کھلی چوٹ غالب کے لیے ممکن نہیں تھی۔''[۵۰]

اس دلیل میں کافی وزن ہے، لیکن اس بات کا امکان روشن ہے کہ غالب نے قلعہ معلّٰی کے کسی بھی مشاعرے میں جس میں بہادر شاہ موجود ہوں، پڑھی ہو، اُس صورت میں مقطع میں ''شاہ کی مصاحبت'' شاعر کی آرزو کہلائے گی، اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ غالب ۱۸۵۰ء سے پہلے اور واقعہ اسیری کے بعد قلعہ معلّٰی کے مشاعروں میں شرکت فرما رہے تھے۔ ۲۱ر فروری ۱۸۴۸ء کا تحریر کردہ غالب کا ایک فارسی خط بنام منشی نبی بخش حقیؔر (نادراتِ غالب میں اوّلین خط) کا اقتباس ہے:

''کل تیموری شہزادوں میں سے ایک نے بزمِ مشاعرہ منعقد کی تھی اور شاعروں کو غزل خوانی کی دعوت دی تھی، مجھے اب شعر کہنے کا دماغ تو رہا نہیں، نہ طبیعت اس طرف مائل تھی مگر بندگی بے چارگی چناں چہ خاص اُسی روز، جب اس جلسے میں جانا تھا بلکہ عین اُس وقت جب پالکی میں بیٹھا ہوا مشاعرے میں شرکت کے لیے جا رہا تھا، چند اشعار بے طلب ذہن میں وارد ہوئے۔''[۵۱]

پھر امتیاز علی عرشی اور کالی داس گپتا رضا ایسے کلامِ غالب کے محققین نے اسے بعد از ۱۸۴۷ء کی غزل قرار دیا ہے۔ اس طویل وضاحت کے بعد ہم پھر دورِ ابتلا کے اُن اشعار کو ملاحظہ کرتے ہیں جن میں قلعہ معلّٰی سے تعلق کی آرزو اور ہم کلامی شاہ کی جھلک نمایاں ہے:

۳۰- اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے ۱۶
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

۳۱- دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا //
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے

۳۲- غالب تمھی کہو کہ ملے گا جواب کیا //
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

ان اشعار کے جائزے کے بعد اب ہم اُس دور میں غالب کے جذبہ واحساس پر سب سے حاوی خیال کوتاہ نصیبی، تقدیر کی جبریت، ایسے مضامین پر مبنی اشعار دیکھتے ہیں:

۱- گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا ۲
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

۲- تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ ۳
اس میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر بھی تھا

۳- پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق //
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

۴- ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ۴
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

۵- ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے //
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

۶- یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا ۵
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

۷- ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے ۶
وہ ہر ایک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

۸- خوب تھا پہلے سے ہوتے تو ہم اپنے بدخواہ ۱۴
کہ بھلا چاہتے ہیں اور بُرا ہوتا ہے

۹- ابنِ مریم ہوا کرے کوئی ۱۶
مرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

۱۰- جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ //
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

۱۱- بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر ۱۷
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

۱۲- میری قسمت میں غم گر اتنا تھا ۱۸
دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

۱۳- آ ہی جاتا وہ راہ پر غالبؔ //
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

آخر میں مذکورہ دونوں شعروں پر بالترتیب میرؔ کے یہ دو شعر یاد آتے ہیں:

کاش کہ دل دو تو ہوتے عشق میں ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں
اُس کے ایفائے عہد تک نہ جیئے عمر نے ہم سے بے وفائی کی

کیا عجب اُس زمانے میں کہ غالب بہت گہرے رنج سے دوچار تھے، انھوں نے خصوصیت سے میر کا مطالعہ کیا ہو، خود ان کے یہاں اس زمانے کے اشعار میں سوز و گداز اور بیانِ غم بہت ہے اور میر کے اعتراف عظمت کا سب سے اہم شعر بھی اسی زمانے کی غزل کا مقطع ہے۔

ریختہ کے تمھی اُستاد نہیں ہو غالبؔ ۳
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

حادثہ اسیری کا ایک اور اہم تخلیقی ردعمل غم کی ماہیت اور احساس رنج کی شدید صورتوں کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس حوالے سے منتخب اشعار غزلوں کی ترتیب اور نمبر شمار کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں:

۱- رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا غزل نمبر ۵
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

۲- غم اگرچہ جاں گسل ہے یہ بچیں کہاں کہ دل ہے //
غم عشق اگر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا

۳- کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بُری بلا ہے //
مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

۴- آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں ۱۰
سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

۵- دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ۱۲
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

۶- رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل ۱۵
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے

۷- ابنِ مریم ہوا کرے کوئی ۱۶
میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی

۸- کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو ۱۷
کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے

خواہشِ مرگ، غزل کی شاعری کا بہت مقبول مضمون ہے، غالب کے یہاں اس کی کثرت اور تنوع، جدّتِ ادا اور طرفگی بیان تمام ادوار کی شاعری میں قابلِ دید ہے، تاہم جس قدر معنی خیزی مضامین مرگ و آرزوئے مرگ بعد از ۱۸۴۷ء کے کلام میں ملتی ہے اس کا جواب نہیں۔ غالب کے اُس یادگار خط کا جملہ ہے کہ ''آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں، میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں۔'' بلاشبہ یہ سانحہ حیاتِ غالب میں ایسی دردناک رسوائی

اور شرمناک بے آبروئی تھا کہ موت انھیں ایسی نعمت دکھائی دیتی ہوگی جس کی تمنا کی جا سکے اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہی بات ناممکن ہو جاتی ہے جس کی تمنا شدت سے کی جائے، اس لیے مرگ کی آرزو کے ساتھ ساتھ حسرتِ مرگ بھی دیکھی جا سکتی ہے:

۱-	ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا	۵
۲-	ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پہ دھرا ہوتا	۶
۳-	ع ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے	//
۴-	ع غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں	۷
۵-	کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے	۱۰
۶-	ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام ایک مرگ ناگہانی اور ہے	//
۷-	موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی	//
۸-	مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے، پر نہیں آتی	//
۹-	قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے	۱۲

یہ شعر وحدت الوجودی تلازمات کا حامل ضرور ہے لیکن معنی کا تمام تر قرینہ، ''آرزوئے وصال'' پر دال ہے۔ اُردو غزل کے مقبول عام مضامین میں متصوفانہ اخلاقیات جیسے تسلیم و رضا، توکل، کل کی خیر اور انسان دوستی وغیرہ کا غالب کے یہاں اثباتی و ایجابی انداز میں ذکر بہت کم ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ ان مضامین سمیت غزل کے ہر مضمون کو اپنی خیال افروزی پر مبنی مضمون آفرینی کے لیے بے دریغ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اس دور کی شاعری میں شاید پہلی مرتبہ

انھوں نے اس طرح بھی سوچا اور محسوس کیا جس طرح سب سوچتے اور محسوس کرتے ہیں۔ ان اشعار میں غالب کی مشمولہ معنی آفرینی کم ہے لیکن کیف و اثر بہت ہے، ملاحظہ ہو:

۱- نہ سنو، گر بُرا کہے کوئی نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی غزل نمبر ۱۶
۲- روک لو، گر غلط چلے کوئی بخش دو گر خطا کرے کوئی //
۳- کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند کس کی حاجت روا کرے کوئی //
۴- جب توقع کی اُٹھ گئی غالبؔ کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی //
۵- ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا اور درویش کی صدا کیا ہے غزل نمبر ۱۲

غالب کی ذات اور فن کارانہ شخصیت کی طبقاتی اور نفسیاتی تعبیروں کے لیے ان کے کلام میں مضامین رشک کی بہتات، تنوع اور جدّت کو کامیابی سے استعمال کیا جاتا ہے، رشک بالعموم محرومی کے جس احساس کا پیدا کردہ ہوتا ہے، اس کے اسباب، تمام تر شدت کے ساتھ، اس زمانے میں لازمۂ حیات غالب تھے، شعر ملاحظہ ہوں:

۱- ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا ۳
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
۲- اُبھرا ہوا نقاب میں ہے، ان کے، ایک تار ۸
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو
۳- اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعد قتل ۹
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
۴- یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے ۱۵
وگرنہ خوفِ بد آموزی عدو کیا ہے
۵- قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو ۱۸
کاش کہ تم مرے لیے ہوتے

طنز غالب کا عمومی لب و لہجہ ہے، ان کی شاعری میں جن سپاہیانہ یا ترکانہ تیوروں کا تذکرہ بالعموم کیا جاتا ہے، ان کا ایک اہم فن کارانہ پہلو طنز ہے۔ غالب کے کلام میں اس کی فراوانی کے حوالے سے اگر یہ کہا جائے کہ طنز ان کا شیوۂ گفتار ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ اٹھارہ سو پچاس اور باون کے زمانے کی غزلوں میں غالب کی طنزیات حد درجہ لطیف،

زہرناک رمزیت اور بہت ذہین ایمائیت کی حامل ہونے کے سبب حد درجہ مہلک اور بلند ادبی مقام کی حامل ہیں۔ اس کا آغاز ۱۸۴۷ء میں ان کی اُردو شاعری کے دوسرے دور کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس زمانے کے (اور بعد کے بھی) ہر شعر کے لب ولہجہ پر ''طنزیہ'' ہونے کا گمان گزرتا ہے اور یہ محض گمان نہیں ہوتا، لیکن ذیل میں طوالت کے خوف سے صرف وہی اشعار درج کیے جاتے ہیں جن میں طنز بہت نمایاں اور لطیف نشریت کا حامل ہو گیا ہے، اور قبل ازیں دیگر حوالوں کے تحت درج اشعار بھی دوبارہ شامل نہیں کیے جا رہے مثلاً کوتاہی نصیب اور آسمان دشمنی وغیرہ عنوانات کے تحت بہت سے طنزیہ اشعار قبل ازیں گزر چکے ہیں:

۱-	ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا	۳
۲-	پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا	//
۳-	ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا	۴
۴-	دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا	//
۵-	ترے وعدے پر جیئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا	۵
۶-	تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا	//
۷-	بچتے نہیں مواخذہ روزِ حشر سے قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو	۸
۸-	کیا وہ بھی بے گنہِ کش و حق ناشناس ہیں مانا کہ تم بشر نہیں، خرشید و ماہ ہو	//

۹- تجھ سے تو کچھ کلام نہیں، لیکن اے ندیم ۹
میرا سلام کہیو اگر نامہ بَر ملے

۱۰- کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ ۱۱
شرم تم کو مگر نہیں آتی

۱۱- ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت غالبؔ ۱۳
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

۱۲- گو سمجھتا نہیں، پر انداز تلافی دیکھو ۱۴
شکوہ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

۱۳- کیوں نہ ٹھہریں ہدف ناوک بیداد کہ ہم //
خود اٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

۱۴- نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا ۱۵
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخ تندخو کیا ہے

۱۵- ہوا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا ۱۵
وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے

۱۶- شرع و آئین پر مدار سہی ۱۶
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

۱۷- بات پر واں زُبان کٹتی ہے //
وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

۱۸- کیا کیا خضر نے سکندر سے //
اب کسے راہ نما کرے کوئی

۱۹- صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو ۱۷
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

۲۰- ضد کی ہے اور بات مگر خو بُری نہیں ״
بھولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

غالب کے یہاں طنز میں تشکیک کا عنصر بھی ہے اور یہ بھی شاید اسی دورِ ابتلا کی دین ہے، اس زمانے میں غالب کا اعتبار شدید صدمے سے مجروح تھا:

۱- میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں ۱
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

۲- ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا ۳
آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

۳- دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بَر ۱۰
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے

۴- جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود (قطعہ) ۱۲
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

مخصوص شعری رجحانات اور ان میلانات کی وضاحت کرنے والے اشعار کے حوالے کے بعد اب اس دور کی ان غزلوں کا الگ سے ذکر ضروری ہے جو غالب کی اسیری کے زمانے کی ذہنی اور جذباتی صورت حال کو مزید سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ ان میں اوّلین غزل ''یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا'' کے مطلع والی ہے۔ یہ غزل غالب کے سرمایۂ تغزل میں بے حد بلند مقام کی حامل ہے۔ اگر غالب کے اُردو کلام سے دس بہترین غزلوں کا انتخاب بھی کیا جائے تو یہ اُن میں ضرور شامل ہوگی۔ پوری غزل کی فضا پرغم، کوتاہی نصیب، طنز اور خواہشِ مرگ وگم نامی کا احساس حاوی ہے۔

''کوئی دن گر زندگانی اور ہے'' کے مطلع کی حامل غزل کے ہر شعر پر غالب کے حادثۂ اسیری کی واضح چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ مطلع سے مقطع تک ہر شعر اُس دکھ کے حامل تجربے کی کسی نہ کسی جہت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ شعر کسی حوالے میں شامل نہیں ہوا:

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

بلاشبہ مقدر کے حوالے سے غالب پر آسمان کی یہ سرگرانی ماضی اور مستقبل کی ساری ''عنایات'' سے الگ اور بڑھ کر تھی۔اس حوالے سے تیسری غزل ''کوئی اُمید بَر نہیں آتی'' کے مطلع والی ہے۔کلام غالب میں اس سے بڑھ کر یاس وافسردگی کے موڈ کی حامل اور کوئی غزل نہیں۔اس غزل کے جو اشعار کسی بھی موضوع کے تحت شامل نہ ہو سکے میں سے کچھ یہ ہیں:

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
ہم وہاں سے ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اس حوالے کی آخری غزل ''ابنِ مریم ہوا کرے کوئی'' ہے۔جس کی پوری فضا پر غالب کے سانحۂ اسیری کے درد و کرب کے ساتھ ساتھ بلند تر اخلاقی روّیوں کا درس اور تلقین بھی ملتی ہے۔

نجی حوالے سے غالب کے لیے یہ سانحہ جتنی تکلیف، دُکھ درد، اذیت، بے آبروئی اور رسوائی کا حامل تھا، اس پر جس قدر بھی افسوس کیا جائے کم ہے، لیکن اس خیر مستور کا سب سے بڑا فائدہ اُردو شعر کو ہوا۔۱۸۴۷ء کے بعد جب غالب دوبارہ اُردو غزل اور شاعری کو میسر آئے تو صحیح معنوں میں وہ شاعری تخلیق ہوئی، جس پر اُردو غزل گوئی کی پوری تاریخ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔۱۸۵۰ء میں قلعہ معلّٰی سے وابستہ ہونے کے بعد غالب نے اُردو میں جس بلند پایہ غزل کی بنیاد رکھی، اُس کے بارے میں خود انھوں نے منشی نبی بخش حقیرؔ کو لکھا: (۱۸۵۱ء)

''داد دینا کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہنچے تو اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور شکل'' [۵۲]

اور ۱۸۵۲ء کے ایک خط میں بجا طور پر یوں اظہار فخر کیا:

''بھائی خدا کے واسطے غزل کی داد دینا، اگر ریختہ یہ ہے تو میرؔ و مرزا کیا کہتے تھے، اگر وہ ریختہ تھا، تو پھر یہ کیا ہے۔۔۔'' [۵۳]

حواشی وحوالہ جات

۱- کالی داس گپتا رضا، غالب درونِ خانہ، ص۲۸۳، ساکار پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی، اوّل، ۲۷/دسمبر ۱۹۸۹ء

۲- مالک رام، ذکرِ غالب، ص۹۰، مکتبہ شعروادب، لاہور، پانچواں ایڈیشن ۱۹۷۵ء

۳- خلیق انجم (مرتب)، غالب کے خطوط، جلد سوم، ص ۵۵-۵۴، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، اوّل ۱۹۹۰ء

۴- شیخ محمد اکرام، حیاتِ غالب، ص۲۹، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، دوم ۱۹۸۲ء

۵،۶- الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، ص۲۹، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی ۱۹۸۹ء

۷- بحوالہ ''غالب'' از غلام رسول مہر، ص۱۸۵، علمی کتاب خانہ، لاہور، تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۴ء

۸- منشی گھن شیام داس عاصی دہلوی، کلام عاصی، ص۲۶۴-۲۶۳

۹- احسن الاخبار، بمبئی، جلد۴، نمبر۱۶۷، بحوالہ دہلی کا آخری سانس، خواجہ حسن نظامی، مطبوعہ دہلی، ص۱۷۱

۱۰- غلام رسول مہر، غالب، ص۱۸۱

۱۱- بحوالہ خواجہ حسن نظامی، دہلی کا آخری سانس، ص۱۶

۱۲- ابوالکلام آزاد۔ بحوالہ غلام رسول مہر، غالب، ص۱۸۶

۱۳- دہلی اُردو اخبار، ۱۵/اگست ۱۸۴۱ء، ص۴، نیشنل آرکائیوز، دہلی

۱۴- احسن الاخبار، بمبئی۔ بحوالہ دہلی کا آخری سانس، از خواجہ حسن نظامی، ص۷۴-۱۷۵

۱۵- بحوالہ الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، ص۲۹

۱۶- منشی گھن شیام داس عاصی دہلوی، کلام عاصی، ص۲۶۴-۲۶۳

۱۷- مولوی کریم الدین، تذکرہ شعرائے اُردو، مطبوعہ العلوم، دہلی، ص۳۷۸

۱۸- الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، ص۳۰

۱۹- غلام رسول مہر، غالب، ص۱۸۳

۲۰- بحوالہ غلام رسول مہر، غالب، ص۱۸۷

۲۱- ترکیب بند۔ حبسیۂ غالب، ترجمہ راقم، شعر نمبر۴۶، ۴۷، ۴۸

۲۲- بحوالہ غلام رسول مہر، غالب، ص ۱۸۵

۲۳ تا ۲۵- ایضاً، ص ۱۸۶

۲۶- غالب کا ایک فارسی خط، ترجمہ الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، ص ۲۹-۳۰

۲۷- بحوالہ شیخ اکرام، حیاتِ غالب، ص ۱۲۰

۲۸- منشی گھن شیام داس عاصی دہلوی، کلامِ عاصی، ص ۲۶۳

۲۹- غلام رسول مہر، غالب، ص ۱۸۴

۳۰، ۳۱- بحوالہ، غالب کے خطوط، خلیق انجم، جلد اوّل، ص م، کراچی، اوّل ۱۹۸۹ء (اور) ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن غالب کا علمی سرمایہ، ص ۱۶، لاہور، اوّل ۱۹۸۹ء

۳۲- الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، ص ۳۰

۳۳- خلیق انجم (مرتب)، غالب کے خطوط، جلد اوّل، ص ۲۵۸

۳۴- پروفیسر کرار حسین، غالب سب اچھا کہیں جسے، ص ۳۰، ادارہ یادگارِ غالب، کراچی، اوّل ۱۹۶۹ء

۳۵- شیخ محمد اکرام، حیاتِ غالب، ص ۱۲۵-۱۲۹

۳۶- مالک رام، ذکرِ غالب، ص ۱۰۹

۳۷- غلام رسول مہر، غالب، ص ۱۸۳

۳۸- سعادت علی صدیقی، غالب پر چند تحریریں، ص ۹۰، انجمن ترقی اُردو ہند، دلّی ۱۹۹۰ء

۳۹- کالی داس گپتا رضا، دیوانِ غالب (کامل)، ص ۸۹، بمبئی ۱۹۸۸ء

۴۰- مالک رام، گفتارِ غالب، ص ۱۳۳، دہلی ۱۹۸۵ء

۴۱- کالی داس گپتا رضا، دیوانِ غالب (کامل)، ص ۲۲-۲۳

۴۲- الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، ص ۳۱

۴۳- خلیق انجم، غالب اور شاہانِ تیموریہ، ص ۱۲، اوّل، دہلی ۱۹۷۴ء

۴۴- ایضاً، ص ۱۳

۴۵- ایضاً، ص ۲۰-۲۱

۴۶- غلام رسول مہر، غالب، ص ۱۸۶

۴۷- کالی داس گپتا رضا، دیوانِ غالب (کامل)، ص۲۹۰ تا۲۹۹

۴۸- الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، ص۱۴۰

۴۹- خلیق انجم، غالب اور شاہانِ تیموریہ، ص۲۲-۲۳

۵۰- ایضاً، ص۲۳

۵۱- بحوالہ نثار احمد فاروقی، تلاشِ غالب، ص۸۴، کتابیات، لاہور، اوّل ۱۹۶۹ء

۵۲- آفاق حسین آفاق، نادراتِ غالب، ص۱۲، کراچی، اوّل ۱۹۴۹ء

۵۳- ایضاً، ص۲۶